مثنویاتِ میر

1882

سیّد محمد

مثنویاتِ میرؔ

(بہ ترتیب)

سیّد محمدؐ ایم۔ اے
مولفِ اربابِ نثر اردو

(ناشر)

اردو کتاب گھر، چارکمان، حیدرآباد دکن

قیمت عہ

۱۳۵۴ف
۱۹۴۵ء
مطبع دستگیری

ف دوم

فہرست

الف

مقدمہ

میر تقی میرؔ اُردو کے اُن چند مخصوص اور مایۂ ناز شعرا میں سے ہیں جن کو قبولیت دوام حاصل ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائیگا ان کے کلام کی قدر و منزلت بھی بڑھتی جائیگی۔ وہ اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے سنہ ولادت صحت و یقین کے ساتھ معلوم نہیں۔ مختلف تاریخی شواہد کی بنا پر قیاساً ۱۱۳۵ھ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے والد کا نام میر محمد علی تھا اور وہ اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے خاص و عام میں علی متقی کے لقب سے مشہور تھے۔

ان کے اجداد تلاشِ معاش میں ابتداً ملکِ حجاز سے نکل کر سرزمین دکن میں وارد ہوئے۔ پھر یہاں سے احمد آباد (گجرات) گئے۔ بعض وہیں رہ پڑے اور بعض آگے بڑھے۔ میر صاحب کے پردادا نے دارالخلافہ آگرہ میں سکونت اختیار کی۔ میر صاحب کے دادا آگرے کی فوجداری کے عہدے پر فائز تھے مگر ان کے والد نے علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ہی ایک درویش کامل کے ہاتھ پر بیعت کر کے زہد و ورع اور فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ وہ ایک بڑے صوفی اور پاک طینت بزرگ تھے

آگرہ اور دہلی کے اکثر امرا و شرفا ان کے زہد و توکّل کی وجہ سے ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے۔ ان کے دو بیویاں ہوئی ہیں۔ میر صاحب دوسری بیوی کے بڑے فرزند ہیں۔ پہلی بیوی سے بھی ایک بیٹے حافظ محمد حسن نامی تھے۔

میر صاحب کی سیادت کے متعلق تذکرہ نویس مختلف الرائے ہیں۔ خود ان کی زندگی میں بھی بعض لوگ ان کے دعوئے سیادت پر حرف زن تھے مگر انھوں نے نہ صرف اپنی نظم بلکہ نثر میں بھی کہیں واضح طور پر اور کہیں مبہم انداز میں اپنی سیادت کا اظہار کیا ہے اور معترضین کے علی الرغم اپنے دعوے پر قائم رہے۔ زمانۂ حال کے بعض اہل الرائے کا یہ خیال ہے کہ جب تک میر صاحب کی سیادت مشتبہ نہ ہو، لوگوں کا اس طرح ذاتی حملہ کرنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا اور یہ کہ اتنے زمانے کے بعد یہ فیصلہ کرنا کہ درحقیقت میر سید تھے یا سیّد بن بیٹھے مشکل ہے لیکن ذاتی عداوت اور دشمنی ایسی بُری چیزیں ہیں کہ لوگ جان بوجھ کر بالکل جھوٹا الزام لگانے سے نہیں چوکتے میر صاحب کی نازک مزاجی اور خودداری مشہور ہے۔ کیا تعجب ہے کہ ان کی اس افتادِ طبیعت کی بدولت یا ان کی روز افزوں شہرت و ہر دلعزیزی کو دیکھکر جو حاسدوں کی نظروں میں ضرور کھٹکتی ہوگی کسی مخالف نے یہ افترا باندھا اور پھر جس کی ان سے بگڑی، اس نے اس چیز کو اچھال دیا اور نخواہ مخواہ ان کی سیادت کو مشتبہ کر دیا۔

میر صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر ہی پر ان کے والد اور والد کے

ایک مرید خاص سیّد امان اللہ کے ہاتھوں ہوئی۔ سیّد امان اللہ نے علی متقی کی نظر کیمیا اثر کے فیض سے عین عنفوان شباب میں گھر بار چھوڑ کر تجرّد و درویشی کی زندگی اختیار کر لی تھی اور اپنے پیر و مرشد کے حضور میں رہتے تھے۔ میر صاحب ابھی سات برس ہی کے تھے کہ ان کے والد نے ان کو سیّد مذکور کے دامنِ تربیت میں دیدیا۔ میر صاحب انھیں چچا پکارتے تھے اور وہ بھی غیر معمولی محبت اور توجہ سے ان کی تربیت کرتے تھے۔ انہی کے پاس میر صاحب نے قرآنِ مجید ختم کیا اور غالباً کچھ ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں انہی کی ہمراہی میں وہ اس زمانے کے بہت سے فقرا و اولیا کی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہوئے۔ اگرچہ یہ اس وقت بہت کم عمر تھے لیکن ایک تو والد اور چچا کی درویشانہ زندگی دوسرے کامل درویشوں کی صحبتوں میں حاضری و شرکت نے ان کے دل پر بچپن ہی سے ایک خاص اثر پیدا کر دیا جو ان کی آیندہ زندگی اور حالات سے مل کر ان کی طبیعت کے ایک جداگانہ اور مخصوص انداز کا باعث بن گیا۔

میر صاحب کی عمر ابھی دس گیارہ برس کی تھی کہ ان کی نازپروردگی اور راحت کا زمانہ ختم ہو گیا اور وہ تلاش معاش و تحصیل علم کے سلسلے میں گوناگوں مشکلات میں پھنس گئے۔ اوّلاً ان کے عم بزرگوار سیّد امان اللہ نے انتقال کیا چند دن بعد باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ "ذکر میر" میں میر صاحب نے ان دونوں سانحوں کو بہت دل گداز انداز میں بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس پینتالیس برس گزرنے کے بعد

بھی اِن کے دل پر ان سانحوں کے کیا تاثرات تھے۔

باپ کے انتقال کے ساتھ ہی سوتیلے بھائی نے جو باپ کی زندگی میں بھی ان کے مخالف تھے سخت کج ادائی کی اور یہ کہہ کر کہ میں نہ باپ کی زندگی میں ان کے کاروبار میں دخیل تھا نہ مجھے اب ان سے کچھ سروکار ہے اپنا دامن جھٹک لیا۔ میر صاحب ہی کو باپ کی تجہیز و تکفین کرنی پڑی جس کے بعد انھوں نے تلاش معاش کی خاطر وطن کو خدا حافظ کہا اور دہلی چلے آئے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ برس کی تھی۔

دہلی میں نواب صمصام الدولہ امیر الامرا کی بدولت جو اُن کے والد کے شناسا اور معتقد تھے کچھ دن آرام سے گزرے لیکن ۱۱۵۱ ہجری میں نواب مذکور نادر شاہ کی جنگ میں مارے گئے اور میر صاحب پھر بے سہارا ہو کر دہلی سے اکبر آباد لوٹ گئے۔ مگر مجبوراً انھیں دوبارہ دہلی آنا پڑا اور اب کی دفعہ وہ سراج الدین علی خان آرزو کے پاس جو اِن کے سوتیلے بھائی کے ماموں اور دہلی کے مشہور عالم اور شاعر تھے رہ کر ان سے تعلیم پانے لگے۔ تھوڑی سی علمی استعداد پیدا ہوئی تھی کہ ان کے سوتیلے بھائی نے اپنے ماموں کو ان کے خلاف لکھا۔ وہ ان کے مخالف ہو گئے۔ اس قدر تنگ کیا کہ کڑھتے کڑھتے انھیں جنون ہو گیا۔ ایک عرصے جنون کی بلا میں مبتلا رہنے کے بعد تندرست ہوئے اور میر جعفر نامی ایک علم دوست کے ہاں پڑھنے لگے۔ انہی ایام میں سیّد سعادت علی امروہی کی توجہ اور امداد سے شعر گوئی بھی شروع کی اور چند ہی روز میں طبیعت کے قدرتی لگاؤ اور جد و جہد سے

اتنی مشق بہم پہنچائی کہ سارے شہر میں مشہور ہو گئے۔

خانِ آرزو کے ساتھ میر صاحب کے تعلقات ان کے بھائی کی مخالفت کی وجہ سے اچھے نہ رہ سکے۔ اور آخر میر صاحب ان کا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ایک روز رات کے وقت توکل بہ خدا چل کھڑے ہوئے۔ ایک شخص نے ان کی صورتِ حال سے انھیں پہچان لیا اور ان کے کلام کے ایک قدرداں امیر رعایت خاں کے ہاں لے جا کر ملازم رکھا دیا۔ رعایت خاں کی عنایات و مراعات سے میر صاحب اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے مگر طبیعت کی خودداری نے ان کو وہاں بھی رہنے نہ دیا۔ ایک دفعہ اس نے فرمائش کی کہ اپنے چند شعر قوال کے لڑکے کو بتا دیں تاکہ وہ انھیں یاد کر کے سنا سکے۔ میر صاحب کو یہ بات اس قدر ناگوار گزری کہ ملازمت کے لحاظ سے فرمائش تو پوری کر دی مگر دوسرے روز سے اس کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ بریں ہمہ رعایت خاں نے اپنا حسن سلوک جاری رکھا اور ان کے بھائی میر محمد رضی کو اپنے گھر سے گھوڑا دے کر ملازم رکھ لیا۔

رعایت خاں کی ملازمت سے الگ ہونے کے بعد میر صاحب بہت سے امیروں اور راجاؤں کے متوسل بنے مگر اس زمانے کی تباہ حالی اور کچھ ان کی خودداری نے انھیں کبھی فارغ البالی سے رہنے نہ دیا۔ بعض امرا اپنی تباہی کی وجہ سے ان کی خاطر خواہ سرپرستی نہ کر سکے اور بعض سے یہ خود کسی نہ کسی بات پر بگڑ کر مستفید نہ ہو سکے۔ آخر کار راجا ناگر مل کی رفاقت اختیار کی جو ان کے کلام کا بہت شایق و قدرداں تھا۔

ان دنوں ملک کی سیاسی صورت حال بالکل بگڑ چکی تھی ۔ دہلی دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی آفات کا نشانہ بنی ہوئی تھی بادشاہ کی قوت روز بروز گھٹتی جاتی تھی ۔ امیر امرا آپس کی عداوتوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے کمزور ہو رہے تھے ۔ اسی زمانے میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اور قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم ہوا کہ دہلی تباہ ہو گئی ۔ چند ہی سال کے بعد احمد شاہ درانی حملہ آور ہوا ۔ پھر مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں نے سر اٹھایا ۔ ان کی ہنگامہ آرائیوں نے اس کی رہی سہی قوت بھی مٹا دی اور طوائف الملوکی اور تباہی و بربادی کا ایسا دور شروع ہوا کہ مغلوں کے زمانے کی دہلی ہمیشہ کے لیے اجڑ گئی ۔

اس ابتری و تباہی کے زمانے میں اور سب شعرا و علما وغیرہ ایک ایک کر کے دہلی چھوڑ چکے تھے لیکن حضرت خواجہ میر درد کی طرح جو آخر وقت تک دہلی میں رہے اور وہیں سپرد خاک ہوئے ۔ میر صاحب بھی کچھ تو امیروں اور راجاؤں کی سرپرستی کی وجہ سے اور کچھ اپنی طبیعت کے استغنا اور خودداری کی وجہ سے دہلی ہی میں رہے مگر جب بہت تنگ ہو گئے تو مع اہل و عیال کسی مقام و منزل کا ارادہ کیے بغیر دہلی سے نکل گئے ۔ دن بھر چلتے چلتے آٹھ نو کوس راستہ طے کر کے رات ایک سرائے میں بسر کی دوسرے روز ایک ہندو خاتون جو ان سے واقف تھی، انھیں اپنے ساتھ بر سارہ لے گئی ۔ وہاں سے نکل کر بہ ہزار دقت و خرابی کاماں ہیٹتے ہوئے کھیر (کنبھیر) پہنچے جہاں ایک عرصے تک راجا ناگرمل کی رفاقت میں بسر کی ۔

اسی راجا کی معیت میں وہ اجڑی ہوئی دلّی اور پھر اپنے قدیم وطن آگرہ کی سیر کرتے ہیں۔ آگرے میں وہ کوئی تیس سال کے بعد وارد ہوئے تھے۔ اِن دونوں مقاموں کی تباہیوں اور بربادیوں کے باعث جو قلب ماہیت ہوگئی تھی اس سے میر صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ آگرے میں اس وقت شعر و سخن کے بہت چرچے تھے اور ان کی آمد کا حال سن کر اکثر نوجوان شاعر ان کے اِرد گرد حاضر رہتے تھے اور ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے، مگر میر صاحب کی نگاہیں اگلا زمانہ ڈھونڈھتی تھیں۔ انھیں ان لوگوں کی صحبت ذرا بھی خوش نہ آئی۔

جب کچھ امن ہوا تو میر صاحب راجا کے ساتھ دہلی واپس ہوئے مگر کسی بات پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور خانہ نشین ہوگئے۔ اس وقت میر صاحب کی شاعری کم و بیش سارے ہندوستان میں شہرت پا چکی تھی اس کے ساتھ ساتھ احساسِ کمال اور احساس ناقدری زمانہ بھی ان میں شدت سے پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ان کی نازک مزاجی بھی بڑھ گئی تھی۔ نواب آصف الدولہ نے جن کے دربار سے دہلی کے اکثر و بیشتر شعرا پہلے ہی توسل اختیار کر چکے تھے ان کو بھی اپنی طبعی قدر دانی سے زادِ راہ بھیج کر لکھنؤ بلایا، میر صاحب دہلی سے بیزار ہو چکے تھے۔ فوراً لکھنؤ روانہ ہوگئے اور نواب کے ہاں باریاب ہوئے۔ نواب نے بہت عزت و توقیر کی اپنی نشست گاہ پر لے جا کر اپنا کلام سنایا۔ ان کا کلام سنا اور دو سو روپے یا بقول مولف تذکرہ گلشن ہند تین سو روپے تنخواہ کر دی۔

میر صاحب ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ آئے اور یہاں اٹھائیس برس رہ کر نواسی یا نوّے برس کے سن میں ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں وفات پائی۔ لکھنؤ ہی میں دفن ہوئے۔ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے قبر کی نشان دہی صحت و یقین کے ساتھ ناممکن ہو گئی ہے۔ مگر عام روایت یہ ہے کہ آغا میر کی ڈیوڑھی کے جنوب مغرب میں جو پرانا قبرستان بھیم کے تکیے کے نام سے موسوم ہے، اسی میں ایک چبوترے پر ان کا مزار ہے۔

میر صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی کل تین اولادیں ہوئیں۔ یہ دونو بیٹے شاعر تھے۔ بڑے میر فیض علی فیض اور چھوٹے میر عسکری عرف میر کلو عرش۔ اول الذکر کے چند اشعار صرف تذکروں میں ملتے ہیں۔ آخر الذکر کا کلام لکھنؤ کے ایک رسالے میں عرصہ دراز قبل شائع ہو چکا ہے۔ تذکرۂ شمیم سخن میں لکھا ہے کہ ان کی بیٹی بھی صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں۔

میر صاحب کے تصانیف شعری میں اردو کلیات کے علاوہ جو غزلیات کے چھ دواوین، قصائد، مثنویات اور متفرق کلام پر مشتمل ہے ایک فارسی دیوان بھی ہے جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ نثری تالیفات میں ایک "تذکرہ نکات الشعرا" ان کی آپ بیتی "ذکر میر" اور پانچ حکایات صوفیہ کا ایک مختصر رسالہ "فیض میر" تینوں شائع ہو چکے ہیں اور ایک یعنی دریائے عشق کا قصہ انھوں نے جو اردو نظم کے علاوہ فارسی نثر میں بھی لکھا تھا ابھی محتاجِ اشاعت ہے۔ میر صاحب کی تالیفاتِ نثر تمام کی تمام فارسی ہیں،

ہیں اور ان سے یہ امر صاف طور پر روشن ہے کہ انھیں فارسی لکھنے میں اچھی مہارت تھی اور وہ ایک طرزِ خاص رکھتے تھے۔ نکات الشعرا اور ذکرِ میر انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئے ہیں اور رسالہ فیضِ میر جس کو میر صاحب نے اپنے فرزند میر فیض علی کی تعلیم کے لئے تصنیف کر کے اسی مناسبت سے یہ نام رکھا تھا، مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی پروفیسر جامعہ لکھنؤ کی سعی و اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف کسی طرح معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ نکات الشعرا جو اردو شاعروں کے اولین تذکروں میں ہے سنہ ۱۱۶۵ھ کی تالیف ہے۔ ذکرِ میر کی تالیف اولاً سنہ ۱۱۸۶ھ میں ہوئی پھر لکھنؤ آجانے کے بعد تازہ واقعات کا اضافہ کیا گیا۔ موجودہ مطبوعہ نسخہ سنہ ۱۱۹۷ھ کے مرتبہ نسخے پر مبنی ہے۔

میر صاحب اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی کے لئے بہت مشہور ہیں یا یوں کہیے کہ بدنام ہیں۔ ان کی زندگی کے متعلق جہاں اور بہت سی باتیں حقیقت سے بالکل دور ہو کر افسانہ و لطیفہ کا رنگ اختیار کر چکی ہیں، ان کے مزاج اور عادات و خصائل کے بارے میں بہت سی حکایتیں مشہور ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کو یہاں تک بدنام کیا ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں دو تین کے سوا کسی کو شاعر ہی نہیں مانتے تھے اور ان کو بھی آدھا یا و اور پون شاعر سمجھتے تھے۔ قدما میں مشہور ترین شخصیتیں مثلاً سعدی و حافظ کی بھی ان کی نظروں میں نہیں جچتی تھیں۔ مگر اس قسم کی باتیں اکثر تذکرہ نویسوں کی مبالغہ آرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نکات الشعرا و ذکرِ میر وغیرہ کے شائع ہو جانے

سے ایسا بہت سا مواد برآمد ہو چکا ہے جس سے ان کی عادات، خصائل اور مزاج و طبیعت کا کما حقہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

میر صاحب کی ابتدائی تربیت ان کے والد اور سید امان اللہ درویش کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ دونوں جیسا کہ ذکر میر سے ظاہر ہوتا ہے بڑے صوفی اور متوکل درویش تھے۔ فقر و درویشی کے ساتھ خودداری، دنیا سے بیزاری اور توکل و قناعت ان کی سیرت کے نمایاں خصوصیات ہیں۔ اگرچہ میر صاحب کو یہ پاکیزہ صحبت بہت دنوں تک نہیں ملی اور والد کے انتقال کے بعد کسب معاش کی خاطر اکثر روسا و امرا کی رفاقت و مصاحبت میں بسر کرنے پر مجبور رہے لیکن بچپن کے یہ اثرات ان کی طبیعت سے بالکل ہٹ نہیں گئے۔ نہ دنیا طلبی میں وہ کامیابی حاصل ہوئی نہ کبھی ایسی جاہ و ثروت نصیب ہو سکی جو طبیعت کا رنگ بدل دے۔ تلاش معاش کی انتہائی کوششوں کے باوجود ان کی عمر کا بڑا حصہ عسرت و تنگدستی میں گزرا۔ وہ ہمیشہ غریب اور مسکین ہی رہے۔ علاوہ بریں ان کی ساری زندگی ملک کے ایک ایسے سیاسی دور میں گزری جس میں ان کا وطن مالوف شہر دہلی بالکل تباہ و تاراج ہو گیا۔ یہ بیرونی حملوں، خانہ جنگیوں، غداریوں اور قتل و غارت کا ایک طویل اور مسلسل دور تھا جس کو میر صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھا اور جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان واقعات نے ان کے خانگی اور ذاتی حالات کے ساتھ مل کر ان کے مزاج میں حد درجہ قنوطیت اور دل گرفتگی پیدا کر دی۔ اپنے کمال کے احساس اور زمانے کی ناقدر دانی اور آشفتہ حالی نے انھیں

بہت تنگ دل اور افسردہ خاطر بنا دیا۔

اِن کی نازک مزاجی، بد دماغی، تنگ دلی اور دردمندی کے یہ اسباب ہیں، ورنہ ان سے قطع نظر وہ منصف مزاج بھی تھے اور ان کی طبیعت میں تواضع و انکسار بھی تھا۔ نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں بہت سے لوگوں کا ذکر نہایت عمدہ الفاظ میں کیا ہے اور اپنی نسبت ایسے الفاظ لکھے ہیں جن سے انکسار اور عاجزی ظاہر ہوتی ہے۔

میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد ہیں۔ نہ صرف ان کے اپنے زمانے کے بڑے اور چھوٹے شاعر بلکہ کم و بیش تمام متاخرہ اساتذۂ سخن نے ان کو ریختے کا استاد تسلیم کیا ہے۔ اِن کی غزلوں میں درد اور سوز و گداز اس قدر ہے کہ کسی اور اردو شاعر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔

غزل گوئی کے علاوہ میر صاحب مثنویاں اور بالخصوص المناک عشقیہ مثنویاں لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ لیکن اس خصوص میں میر حسن کو مثنوی سحر البیان کی بدولت جو شہرت و مقبولیت عام حاصل ہوئی، اس نے میر صاحب کی مثنویات کو ایک حد تک تاریکی میں ڈال دیا۔ پھر بھی اِن کی چند مثنویاں بہت مشہور ہوئیں اور کئی شاعروں نے اِن کی تقلید میں اس قسم کی مثنویاں لکھنے کی کوشش بھی کی ہے اکثر معتبر تذکرہ نویسوں نے ان کی مثنوی نگاری کی تعریف کی ہے۔

اصنافِ سخن میں مثنوی ایک بہت دل چسپ صنف ہے۔ اس میں خارجی اور داخلی دونوں قسم کی شاعری بہ احسن الوجوہ ممکن ہے۔

قصیدہ، غزل، مسدس یا ترجیع بند میں مسلسل مضامین باندھنے میں جو مشکلات حائل ہیں وہ اس میں مطلقاً نہیں۔ غزل اور قصیدے میں ظاہر ہے کہ ایک ہی قافیے کی پابندی کی وجہ سے مسلسل مضامین کا باندھنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مسدس اور ترجیع بند کا بھی ایک حد تک یہی حال ہے۔ مسدس میں چار مصرعوں کا ایک قافیے میں ہونا اور پھر آخری دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ ترجیع بند میں کسی قدر وسعت ضرور ہے لیکن ہر بند کے آخر میں ترجیع کا شعر لانا پڑتا ہے۔ جس سے تسلسل مضمون میں کھانچے پڑ جاتے ہیں۔ پھر ایک بند میں ایک بات یا ایک خیال کو بخوبی بیان کیا جاسکتا ہے اور سارا بند اسی کی نذر کر دینا پڑتا ہے۔ مسلسل مضامین میں کوئی بات چھوٹی ہوتی ہے اور کوئی بڑی۔ ایسی صورت میں اس کا نباہنا اس قدر مشکل ہے کہ مشاق سے مشاق شعرا بھی اس میں بہ ہمہ وجوہ کامیاب ہونے کی بہت کم توقع کر سکتے ہیں۔ البتہ مثنوی ایک ایسی صنف ہے جس میں جس قدر وسیع مضمون چاہو باندھ لو۔ نیز غزل اور قصیدے کے تمام مضامین بھی عمدگی سے بیان ہو سکتے ہیں اگر ایک طرف طویل سے طویل قصوں اور تاریخی واقعات کو نظم کیا جاسکتا ہے تو دوسری فطرت انسانی کی رنگارنگ کیفیتوں، جذبات و احساسات کے نازک سے نازک پہلوؤں اور مناظر قدرت کی مصوری کی جاسکتی ہے۔

عربی زبان میں مثنوی کو کچھ زیادہ فروغ نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں شاہنامہ و سکندر نامہ وغیرہ جیسی طویل نظمیں نہیں پائی جاتیں

مگر عربوں نے یہ کام قصیدے ہی سے لیا ہے اور اس میں وہ تمام وسعت بہم پہنچانے کی کوشش کی ہے جو فارسی اور اردو دانوں کو مثنوی میں حاصل ہے اس کا ایک سبب عربی زبان کی وسعت اور اس میں الفاظ کی کثرت ہے پھر اس کے الفاظ کی بنیاد کچھ ایسے بسیط قاعدوں اور اصولوں پر ہے کہ آسانی سے مشتقات بنا لیے جا سکتے ہیں۔ مثنوی کو سب سے زیادہ عروج فارسی میں ہوا۔ فارسی زبان اس صنف میں بہترین اور نہایت وسیع ادب کی سرمایہ دار ہے اور اس زبان کے جن شہ کاروں کو بقائے دوام اور عالم گیر شہرت حاصل ہے ان میں بڑا حصہ مثنویوں ہی کا ہے۔

فارسی کے اثر سے اردو میں بھی غزل اور قصیدے کی طرح مثنوی رائج ہوی۔ اُردو شاعری کے ابتدائی دور میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں اور دکنی شاعروں نے نہ صرف عشقیہ بلکہ رزمیہ، بزمیہ، حکمیہ اور مذہبی مثنویاں بھی خاصی تعداد میں لکھی ہیں لیکن شمالی ہندوستان میں اُردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی اس زمانے کی عام نکبت اور زوال کی وجہ نیز ولی اورنگ آبادی کی غزلیات کے شوق تقلید کی وجہ سے غزل گوئی کا رجحان بڑھ گیا اور مثنوی کی ترقی کی راہیں رک گئیں۔ شمالی ہند کے شعرا نے اس صنف کی طرف بہت ہی کم توجہ کی اور جو شعرا کچھ متوجہ بھی ہوے تو انھوں نے زیادہ تر عشقیہ مثنویاں لکھیں، رزم و بزم، حکمت و موعظت اور روایات و حکایات کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوے۔

اِن معدودے چند شعرا میں جنھوں نے اس صنف میں کامیابی

کے ساتھ کام کیا اور اپنے یادگار کارنامے پیش کیے۔ میر تقی میر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے نہ صرف عشقیہ مثنویاں ہی لکھی ہیں بلکہ مختلف موضوعات کے لیے اس صنعت کو خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے المناک عشقیہ مثنویاں لکھنے میں کوئی اور شاعر ان کے درجے کو نہ پہنچ سکا۔

اگرچہ میر صاحب سے پہلے دکنی شعرا نے بہت سی مثنویاں لکھی تھیں اور ان میں سے بعض میر صاحب کی نظر سے گزر چکی تھیں لیکن شمالی ہند میں غزل کی طرح مثنوی کا عام رواج نہ ہونے کی وجہ اس کی زبان غزل کی زبان کی طرح شستہ اور منجھی ہوئی نہیں تھی۔ میر صاحب نے مثنویات لکھ کر نہ صرف اس صنف کو رواج دینے کی کوشش کی ہے بلکہ مثنوی کی زبان کی اصلاح و ترقی کا راستہ بھی ایک حد تک صاف کر دیا ہے۔ ربط و تسلسل کے علاوہ جو مثنوی کے لیے نہایت ضروری ہے قدرت زبان اور اسلوب بیان کی سادگی و صفائی ان کی مثنویات کی خاص خصوصیت ہے جس نے ان کی طبیعت کے سوز و گداز اور انفعال و تاثر کے ساتھ مل کر ان میں بلا کا درد و اثر پیدا کر دیا ہے۔

میر صاحب نے کل ۳۳ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے چھ عشقیہ ہیں سات کا تعلق نواب آصف الدولہ اور ان کے دربار سے ہے۔ ایک مثنوی مدحیہ اور چھ ہجویہ ہیں۔ باقی تیرہ مثنویاں میر صاحب کی ذات خانگی زندگی، معاشرت اور ماحول سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان کی عشقیہ مثنویوں میں کوئی طویل اور پیچیدہ پلاٹ نہیں بلکہ سب بہت ہی مختصر اور سیدھے سادے عشقیہ قصے یا واردات عشق و محبت کے مرقع ہیں۔ "معاملات عشق" اور "جوش عشق" میں تو اپنی ہی کیفیات عشق اور مصائب ہجر و فراق کو نظم کیا ہے۔ سوائے جوش عشق کے دوسری مثنویوں کی تمہید میں خود عشق کی حقیقت اور اس کی عمومی و عالمگیر کارفرمائیوں سے بحث کی ہے اور آخر میں بھی عشق ہی کے ذکر پر مضمون مثنوی کو ختم کیا ہے وہ خود عشق و محبت کی چاشنی سے لذت اندوز ہو چکے تھے اور ان کے درد آشنا دل پر اس کی الم انگیز کیفیات گزر چکی تھیں قطع نظر اس سے ان کی ابتدائی تربیت بھی تصوف و عشق الٰہی کی فضا میں ہوئی تھی۔ ان کے والد خدائے تعالیٰ کے عشق و محبت میں سرشار تھے اور "شب و روز یادِ الٰہی میں بسر کرتے تھے" وہ ان کو بھی باوجود ان کی کم عمری کے عشق کی تلقین کرتے تھے۔ چنانچہ خود میر صاحب ذکر میر میں لکھتے ہیں۔

می گفت کہ ای پسر عشق بورز، عشق است کہ درین کارخانہ متصرف است، اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست، بے عشق زندگانی وبال است، دل باختۂ عشق بودن کمال است، عشق بسازد، عشق بسوزد، در عالم ہرچہ ہست ظہورِ عشق است، آتش سوزِ عشق است، آب رفتارِ عشق است، خاک قرارِ عشق است، باد اضطرارِ عشق است، موت مستی عشق است، حیاتِ ہوشیاری عشق است،

شب خواب عشق است، روز بیداری عشق است، مسلم جمال عشق است، کافر جلال عشق است، صلاح قرب عشق است، گناہ بعد عشق است، بہشت شوق عشق است، دوزخ ذوق عشق است، مقامِ عشق از عبودیت و عارفیت و زاہدیت و صدیقیت و خلوصیت و مشتاقیت و خلیت و حبیبیت برتر است، جمع بر آنند کہ حرکتِ آسمانہا حرکت عشقی است یعنی بہ مطلوب نمی رسند و بسر گردانند۔

بے عشق نباید بود بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی عشق پسرے دارد

اس کے پڑھنے کے بعد مثنویات کے اشعار متعلق عشق و محبت کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے نزدیک عشق کی کیا ماہیت و مرتبت تھی اور وہ کیفیاتِ عشق سے کس قدر باخبر تھے۔

ان کی مثنویات میں اشخاص قصہ جس عشق و محبت میں گرفتار ہیں وہ ہوسناکی اور شاہد بازی سے بالکل الگ ہے۔ اس کی بنیاد محبت کے پاک اور فطری جذبے پر ہے۔ ہر ایک قصے کا انجام عشق کی قربان گاہ پر عاشق و معشوق کی قربانی ہوتا ہے اور سچی محبت اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

میر صاحب نے ہر مثنوی میں داستانِ عشق کے مختلف مقامات کو

بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے اور خاص طور پر ان کیفیات کو جو تیرِ عشق سے گھائل ہونے کے بعد ایک عاشق پر طاری ہوتی ہیں۔ یہ کیفیات فطرت کے گہرے مطالعہ کے علاوہ ان کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہیں اور اسی لیے بے حد موثر اور پُر درد ہیں۔

لکھنؤ میں میر صاحب کا زمانہ خاصے اطمینان اور فارغ البالی میں گزرا نواب آصف الدولہ اِن کے مرتبۂ شاعری کے برابر ہی ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اگرچہ پچاس ساٹھ برس کی پُر مصائب زندگی اور ضعیفی و پیری نے انھیں عشرت و راحت سے پورے طور پر لطف اندوز ہونے کے قابل نہیں رکھا تھا بریں ہم وہ لکھنؤ آکر دربار کے تعلق سے شاہی ضیافتوں اور تقریبوں وغیرہ میں حصہ لیتے ہیں اور ایسے موقعوں پر نظمیں بھی لکھتے ہیں وہ دو دفعہ نواب ... کے ساتھ سفرِ شکار میں بھی ہم رکاب رہے۔ پہلی دفعہ بہرائچ (بھڑائچ) جانا ہوا اور دوسری دفعہ کوہ شمالی کے دامن تک۔ اگرچہ دوسری دفعہ کا سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ بارش، سردی، اور راستے کے نشیب و فراز سے لوگ گھبرا اٹھے تھے اور کوئی تین ماہ تک مسلسل جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی لیکن اس موقع پر نہ صرف شکار ہی بہت عمدہ ہوا بلکہ خوشگوار ہواؤں اور دلفریب موسموں نے بہ حیثیت مجموعی اِس سفر کو بہت کامیاب بنا دیا تھا۔ شاہی تقاریب اور شکار کے سلسلے میں میر صاحب نے تین صید ناموں کے علاوہ مندرجہ ذیل چار مثنویاں بھی لکھی ہیں۔

(۱) کتخدائی آصف الدولہ (۲) ہولی (۳) ساقی نامہ ہولی (۴)

ساقی نامہ۔

صید ناموں کو میر صاحب نے نواب کے سفر شکار کے ارمغان اور یادگار کے طور پر بہت اہتمام سے لکھا ہے چنانچہ تیسرے صید نامے کے آخر میں خود فرماتے ہیں کہ جس طرح فردوسی اور کلیم شاہ نامہ اور شاہ جہاں نامہ کہہ کر اپنے ممدوحین کی شہرت اور یادگار کے باعث ہوے ہیں نے بھی نواب آصف الدولہ کے لیے صید نامے لکھے ہیں تاکہ ان کے نام نامی کا ہمیشہ چرچا رہے۔

صید ناموں میں میر صاحب نے شکار کے مفصل مرقع پیش کیے ہیں درندوں پرندوں اور دریائی جانوروں کے شکار کی تفصیل کے علاوہ راستے میں جن چڑھے ہوے دریاؤں اور بلند پہاڑوں کو عبور کرنا پڑا یا خار زار اور گھنے جنگلوں میں سے گزرنا پڑا ان سب کو بہت صفائی اور خوبی سے بیان کیا ہے۔ دوران سفر میں جو پُر فضا مقامات ملے اور موسم میں جو خوش گوار یا ناخوش گوار تبدیلیاں ہوئیں ان سب کو بھی بہت صداقت آمیز اور دل پذیر طریقے پر بیان کیا ہے۔

صید ناموں میں میر صاحب نے اپنے فطری جوش تغزل میں جگہ جگہ غزلیں بھی کہی ہیں مگر اس کا التزام بھی رکھا ہے کہ وہ صید ناموں سے بے ربط اور بے جوڑ نہ ہو جائیں۔ ان میں سے بعض غزلیں بہت ہی عمدہ ہیں اور جیسا کہ میر صاحب ذکر میرؔ میں تصریح فرماتے ہیں نواب آصف الدولہ نے ان میں سے بعض غزلوں کو اس قدر پسند کیا کہ خود ان کی تخمیس بھی کی۔

کتخدائی آصف الدولہ کی مثنوی میں اس تقریب کی رنگ رلیوں اور خوش مستیوں کے علاوہ دولہا کے جلوس کا سماں بہت ہی دلچسپ ہے ساقی ناموں اور ہولی کی مثنویوں میں عیش و عشرت کی خلاف توقع دل کھول کر داد دی گئی ہے اور آتش بازی اور رنگ کھیلنے کے مناظر دکھائے گئے ہیں، ان تمام مثنویات سے عہد آصف الدولہ کی شوکت اور عیش و عشرت کا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔

ہجویات کی اخلاقی برائی سے قطع نظر، ادبیات میں یہ اپنی خاص اور ملیح صورتوں میں عجیب دلچسپ اور کارآمد چیز رہی ہے اس سے بسا اوقات ایسی عمدہ اصلاحیں ہو جاتی ہیں جو سنجیدہ نصائح، پُرمغز استدلال اور واعظانہ مخاطبت سے نہیں ہو سکتیں۔ کم و بیش ہر زبان کی ادبیات میں استادانِ سخن نے ہجویات و مطائبات سے اپنا دل بہلایا، دوسروں کی ضیافت طبع کا سامان کیا اور اپنے مخالفین کی خبر لی ہے۔ متین اور سنجیدہ بننا اس قدر مشکل نہیں جس قدر ظریف بننا مشکل ہے۔ اسی طرح ہجو لکھنا اور ساتھ ہی سنجیدگی و ثقاہت کو بھی برقرار رکھنا مشکل کام ہے۔ ہجو میں اکثر و بیشتر فحش کلامی اور بیہودگی شروع ہو جاتی ہے اور لطافت و خوش طبعی غائب ہو کر ایسی گندگی اچھلنے لگتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اکثر شعرا نے ہجو کے خارزار میں قدم رکھا ہے مگر بہت کم اپنا دامن کانٹوں سے بچا کر صحیح و سالم نکل سکے ہیں۔

میر صاحب نے بھی بہ تفصیل ذیل چھ ہجویاں مثنویاں لکھی ہیں:۔

(۱) اژدر نامہ (۲) تنبیہ الجہال (۳) ہجو نااہل (۴) مذمت آئینہ دار

(۵) ہجو سگ پرست، (۶) ہجو اکول۔ ان کے علاوہ بعض دوسری مثنویوں میں بھی کہیں کہیں چند ہجویہ اشعار آگئے ہیں۔ مثلاً سگ و گربہ میں عبید زاکانی کی ہجو میں اس لیے ایک سخت لفظ لکھ دیا کہ اس نے اپنی نظم موش و گربہ میں بلّی کی ہجو کی تھی مگر اس قبیل کے ہجویہ اشعار مستقل حیثیت نہیں رکھتے اور کچھ زیادہ قابلِ لحاظ نہیں۔ مثنویات مذکور الصدر میں سے پہلی دو مثنویوں اژدر نامہ و تنبیہ الجہال میں ہجو و مذمت کسی خاص شخص کی نہیں ہے بلکہ ان کا روئے سخن میر صاحب کے مخالفین اور ان کی شاعری پر رشک و حسد سے زبردستی اعتراض کرنے والے شاعروں کی طرف ہے۔ تیسری مثنوی بھی ایک نااہل شاعر کی ہجو میں ہے جو میر صاحب کے منہ آنے لگا تھا اور انھیں بہت دق کر دیا تھا۔ اسی طرح چوتھی مثنوی بھی جس میں آئینہ دار (نائی) کی مذمت کی گئی ہے شعر و شاعری ہی کے سلسلے میں ہے۔ ایک یا چند اشخاص جو اپنے آبائی پیشے کے لحاظ سے نائی تھے شاعری کرنے لگے اور میر صاحب کے علی الرغم اس کا ادعا کیا تو یہ ایسے بگڑے کہ اس فرقے کی تمام کھلی ڈھکی برائیوں اور خباثتوں کی پوٹ کھول کر رکھ دی۔ ہجو سگ پرست اور ہجو اکول دونوں شخصی و ذاتی عداوت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

میر صاحب کی ہجویات میں کہیں کہیں ایسے شعر نکل آتے ہیں جن میں خوش طبعی اور لطیف ظرافت ہے ورنہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خوش طبعی اور زندہ دلی کے ساتھ ہجو کرنا آتا ہی نہیں۔ وہ اس مظلوم کی طرح جو بالکل نہتا اور بے بس ہو کر زبانی اپنے دل کا بخار نکالتا ہے اور غیظ و غضب میں

آکر سخت غیر غلط کہنے سے بھی نہیں رکتا، بگڑتے اور برا بھلا کہتے ہیں اور ایک غریب دل جلے شخص کی طرح اپنی استادی، گوشہ نشینی، مظلومیت اور نا اہلوں کی بدسلوکی اور مردم آزاری کا رونا روتے ہیں بعض دفعہ جل کر گالیاں بھی سنانے لگتے ہیں۔ اس زمانے میں شاعروں کا اخلاقی معیار کچھ ایسا گرا ہوا تھا کہ نہ صرف میر صاحب بلکہ کئی اور سنجیدہ شاعر اس حمام میں عریاں نظر آتے ہیں۔ میر صاحب کے برخلاف ان کے معاصر مرزا رفیع سوداؔ کو ہجوگوئی میں بڑا کمال تھا۔ اِن کے ہاں ہر صنف کا ہجویہ کلام بکثرت ہے مگر وہ اپنی فطری خوش طبعی اور شوخ مزاجی کی وجہ سے اِس انداز میں ہجو کرتے ہیں کہ نہ صرف دوسرے لوگ بلکہ ایک بار خود وہ شخص جس کی ہجو کی گئی ہے، ان کی طباعی اور شوخی پر ہنس پڑے تو کچھ تعجب نہیں۔ وہ مخالف کی باتوں سے متاثر اور رنجیدہ ہوئے بغیر بے تکلفی سے ایسی ہجو لکھتے ہیں کہ وہ شخص جس کی ہجو کی جلے پانی پانی ہو جائے اور سننے والے اُن کی طباعی اور مضمون آفرینی کی ہنس ہنس کر داد دینے لگیں۔ ہجویات میں بھی میر صاحب کی خصوصیات نمایاں طور پر روشن ہیں۔

ان مثنویات میں جن کا تعلق میر صاحب کی ذات، زندگی اور معاشرت و ماحول سے ہے، مثنوی "خواب و خیال" بہت ہی دلچسپ اور اہم ہے خان آرزو کے ہاں قیام کے زمانے میں میر صاحب کو جو پہلے ہی سے بہت شکستہ دل اور ستم رسیدہ تھے خانِ مذکور کے دل آزار سلوک کی وجہ سے کڑھتے کڑھتے جنون ہو گیا مثنوی "خواب و خیال" اسی جنون کی کیفیات و واردات کا

منظوم مرقع ہے اور دل پذیری اور تاثیر میں ڈوبا ہوا۔ اسی طرح مثنوی "دنیا" پیری و ضعیفی کے حالات کی درد انگیز تصویر ہے۔ اس کی ابتدا میں دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کو بہت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔ پھر اپنی ضعیفی اور بڑھاپے کی تکالیف و مصائب کو تفصیل وار اس انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں متاثرانہ ہمدردی کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں "ذکر میر" میں بھی میر صاحب نے اپنے واقعہ جنون اور ضعیفی کا حال لکھا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مثنویاں شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ان پر گزرے ہوئے واردات و واقعات کی نہایت صداقت آمیز تصویریں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اِن میں بلا کی تاثیر ہے۔

"سرگزشت سفر" خانہ میر، مینھ کی طغیانی" ان کی بے خانمانی، پریشاں حالی اور مسافرت کی تکالیف و مصائب کی روداد یں ہیں مثنوی "مرغ بازاں" اس زمانے کے اہلِ لکھنو کے شوقِ مرغ بازی کا مرقع ہے۔

ان تمام مثنویات سے میر صاحب کی خانگی زندگی اور ماحول کی نسبت نہایت مستند معلومات حاصل ہوتی ہیں اور اگر وہ بجائے خود عمدہ مثنویاں نہ بھی ہوں تو میر صاحب کے سوانح نگار اور اِن کے خانگی حالات کے متلاشی کے لیے ان کے اندر نہایت کار آمد مواد موجود ہے فقط

حیدر آباد دکن
یکم جنوری ۱۹۳۲ء

سید محمد
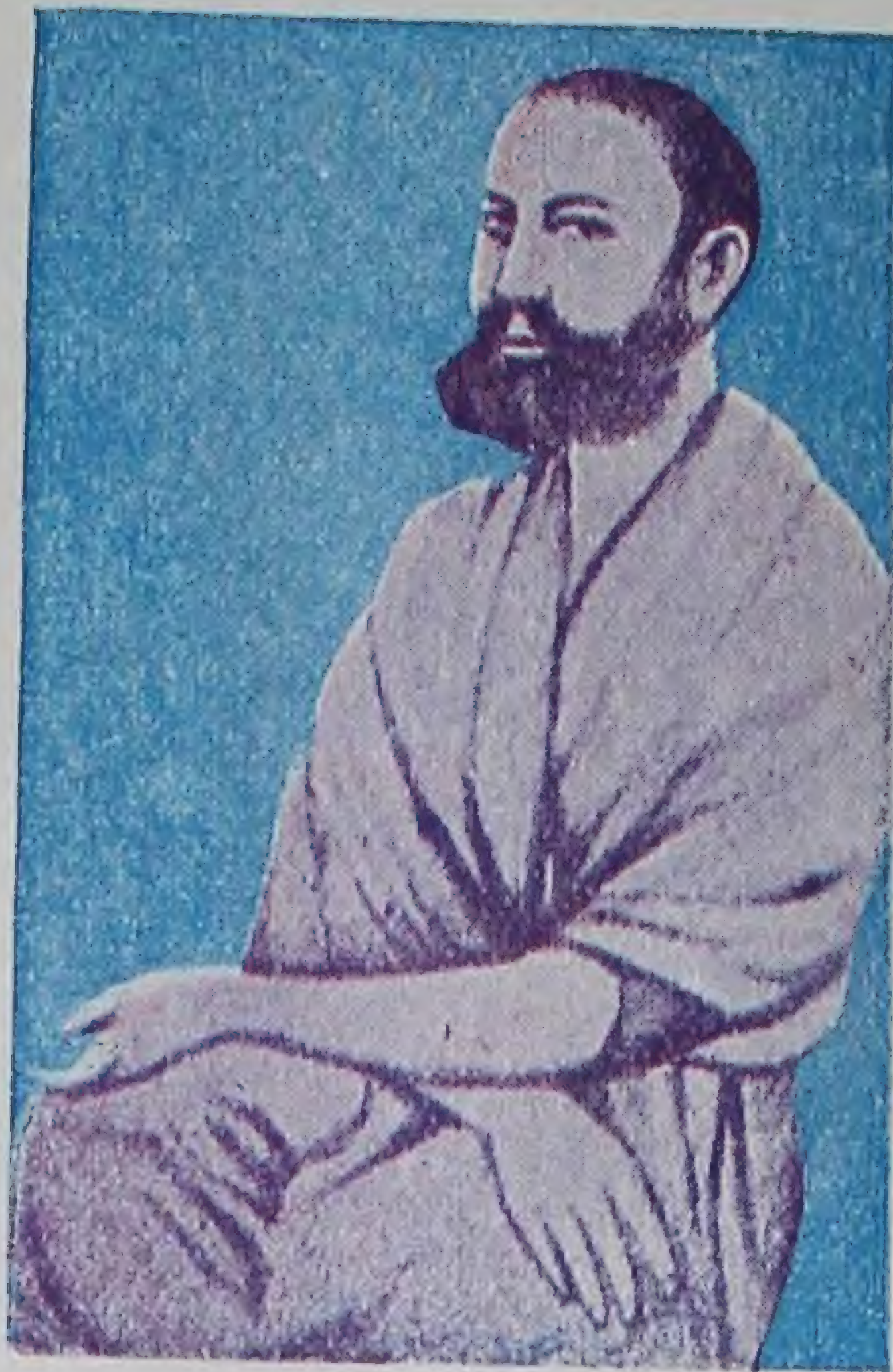
میر محمد تقی میر

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار۔

(۱)

دریائے عشق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال — ہر جگہ اُس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اُس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
یاں تپیدن ہوا جگر کے بیچ — واں تبسم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں خوں چکاں حکایت ہے
ہے کہیں دل میں نالۂ جاں کاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں کے آہ
ہے کسو کی پلک کو نم ناکی — ہے کہیں خاطروں میں غم ناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
کہیں اندوہِ جانِ آگہ تھا — سوزشِ سینہ ایک جا گہ تھا
کہیں عشّاق کا نیاز ہوا — کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا
ہے کہیں دل جگر کی بے تابی — ہے کسو مضطرب کی بے خوابی
کسو چہرہ کا رنگِ زرد ہوا — کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا

طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا — بے ستوں میں شرار تیشہ رہا
کہیں نے زار میں لگائی آگ — کہیں تیغ اور گلو میں رکھی لاگ
کہیں افغانِ مرغِ گلشن تھا — کہیں قمری کا طوق گردن تھا
کہیں مسلخ میں جا فشارہ ہوا — کہیں دل ہو کے پارہ پارہ ہوا
ایک عالم میں دردمندی کی — ایک محفل میں جا کسپندی کی
ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود — ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا — اک سمے میں جگر کی کاہش تھا
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خارِ دلِ غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جانِ پُر غم کا
آرزو ہے امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی
نمکِ زخمِ سینہ ریشاں ہے — نگہِ یاسِ ہجر کیشاں ہے
حسرت آلودہ آہ ہے یہ کہیں — شوق کی اِک نگاہ ہے یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محرومِ وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے — ہاں یہ نیرنگ ساز یکّا ہے
جس کو ہو التفات اُس کی نصیب — ہے وہ مہمانِ چند روزِ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغازِ قصّہ

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار و سروِ بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اُس کو صورتِ خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دل کش سے
تھا طرح دار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
کوئی ترکیب گر نظر آتی — صورتِ حال اور ہو جاتی
دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
زلف ہوتی کسو کی گر برہم — دیکھتے اس کے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشمِ سیاہ — دل سے بے اختیار بھرتا آہ
سر میں تھا شور، شوق دل میں تھا — عشق ہی اس کے آب و گل میں تھا
الغرض وہ جوان خوش اسلوب — ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا — سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھیرا — کہیں سبزے پہ ایک دم ٹھیرا
اِک خیاباں میں سے ہو نکلا — ایک سایے تلے سے رو نکلا
نہ تسلّی ہوا دلِ بے تاب — نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو — ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو نا اُمیدانہ — رُو کیا اس نے جانبِ خانہ

دل کے رکنے کا ایک تو غم تھا
راہ چلنے میں حال درہم تھا

ناگہ اک کوچہ سے گزار ہوا
آفتِ تازہ سے دُچار ہوا

ایک غرفے میں ایک مہ پارہ
تھی طرف اس کے گرم نظّارہ

پڑ گئی اِس پہ اِک نظر اُس کی
پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداع طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

مُنھ جو اس کی طرف سے اُس کا پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر وہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُس کا
ہوا بے طرح گو کہ حال اُس کا

جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے اک بارہ

وہ گئی اِس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا تپیدنِ ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاوں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جا کہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطر افگار و خار خار ہوئی
جاں تمنا کشِ نگار ہوئی

اُس کے منھ پہ پڑی تھی جو کہ نگاہ
نا اُمیدی کے ساتھ تھی ہمراہ

خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خونِ ناب، ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا
خلق اُس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسی نے شفقت سے
رو دیا اس نے ایک حسرت سے
جا کے اُس کے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنا یا نہ
عاشق اس کو کسو کا جان گئے
اور بُرا اس ادا سے مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی ان کی
ایک جا بود و باش تھی ان کی
وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے
درپے دشمنیٔ جان ہوئے
مشورت کی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھیری کہ ہوں گے ہم بدنام
سُن کر آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کس نے مارا اُسے، کہاں مارا
ہووے گر خونِ خفتہ یہ بیدار
کھینچنی ہووے خفّتِ بسیار
کیجیے اس کو ایک ڈھب سے تنگ
تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھیے اُس کے سر
کیجیے سنگسار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار
ہو گئے سارے درپے آزار
کی اشارت کہ کودکانِ شہر
آئے لبریز غصّہ و پُر قہر
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آ کے زیر سنگ کیا

ایک نے ابتدا ملامت کی | ایک نے شور سے قیامت کی

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر | ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر

ایک اُسے تیر سے ڈراتا تھا | ایک برچھی اُسے دکھاتا تھا

ایک کہنے لگا کہ او بے ننگ | زندگانی کا ہے یہ کوئی ڈھنگ

گرچہ ہنگامہ اس کے سر پر تھا | لیک روے دل اس کا اُدھر تھا

محو تھا اس کے بہ خیال کے بیچ | تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

ہونٹھ پر حسن کا بیاں اُس کا | سر تھا اور سنگِ آستاں اُس کا

ایک دم سرد آہ بھر اُٹھتا | نالۂ گرم گاہ کر اُٹھتا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے | اس طرف اک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ | دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

چشمِ تر سے لہو بہا کرتا | صبح کو باد سے کہا کرتا

کاے نسیمِ سحر یہ اس سے کہہ | مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے | جان پر آ بنی ہے تیرے لیے

جو ہے سو دشمنی میں ہے سرگرم | تو بھی آ کر تو چشم کو کر گرم

جان دوں تیرے واسطے سو تو | آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی | دور پہنچی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ | تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

نا امیدانہ گر کروں ہوں نگاہ | دیکھتا ہوں ہزار روے سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد | ایک میں خوں گرفتہ، سو جلاد

کوئی مشفق نہیں جو ہووے شفیق — بے کسی میں نہیں ہے کوئی رفیق
نالہ ہوتا ہے گہہ گہے دل جو — گریہ آنسو سے پونچھتا ہے رو
آہ جو ہم دمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
اور یہ ماجرا ہوا مشہور — شور رسوائیوں کا پہنچا دور
دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب — جانا ہر اک نے عاشق بے تاب
ہونٹھ پر اس کے رنگِ خون نہیں — عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں
تھی نگاہ اس کی جس طرف مائل — اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
جب ہوئی قیل و قال اکثر میں — چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا — مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
تا کہ یہ غیرتِ مہِ تاباں — جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع — نور افزائے خانہ ہو چوں شمع
گھر تھا ایک آشنا کا مدِّ نگاہ — واں ہو روپوش تا یہ غیرت ماہ

شب محافے میں کر کے اس کو سوار
ساتھ دی ایک دایۂ غدّار

پار دریا کے جلد رخصت کی — اس طرح فکر رفع تہمت کی
گھر سے باہر محافہ جو نکلا — اُس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
تپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ
واں کے رہنے سے اس کو کام نہ تھا — وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا

جس کے دل کو کمال ہو الفت — جس کی جانب درست ہو نسبت
جنبش اس کی پلک کو گراں ہو — دل میں یاں کاوش اک نمایاں ہو
یار کو درد چشم گر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے
چاک دامن ہے واں پئے زینت — یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت
واں دہن تنگ، یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یک رنگی
دست افشاں و پاے کوباں یہ — تھا محافے کے ساتھ پویاں یہ
ہر قدم تھا زباں پہ یہ جاری — خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہم رہی اس کی تھی میسر کب — ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب
رفتہ رفتہ سخن ہوے نالے — اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابی نے دل میں زور کیا — اُس نے بے اختیار شور کیا
دل کے غم کو زبان پر لایا — آفتِ تازہ جان پر لایا
کاے ستم پیشہ و تغافل کیش — اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
منہ چھپایا ہے تو نے اس پر بھی — نگہِ التفات اِیدھر بھی
صبر کس کس بلا پہ کر گزروں — چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں
منزلِ وصل دور، میں کم پا — تجھ کو اس مرتبہ میں استغنا
ہے تو نزدیک دل سے، اے طناز — لیکن تجھ تک سفر ہے دور دراز
ناز نے ایک دم نہ فرصت دی — آئینے نے کبھی نہ رخصت دی
تُو تو واں زلف کو بنایا کی — جان یاں پیچ و تاب کھایا کی
تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی چال — ہیں ستم کش ہوا کیا پامال

تھی تجھے اپنے خال و رُخ پہ نگاہ　　دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ
بستر خواب پر تجھے آرام　　مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام
واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے　　یاں فسردہ جگر میں دنداں تھے
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے　　رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطّف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

گوش زد دایہ کی ہوا یہ سخن　　تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلّی کی　　وعدۂ وصل پر تشفی کی
کائے ستم دیدۂ غم دوری　　ہو چکا اب زمانِ مہجوری
زار و نالہ نہ کر شکیبا ہو　　عشق کا راز تا نہ افشا ہو
دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے　　چل کوئی دم میں دادِ خواہش دے
سخت دل تنگ تھی یہ غیرتِ ماہ　　قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے　　ان کے بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا　　نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزم عشرت کریں گے باہم ساز　　ہو جیو اپنے دوست کا دمساز
دے کے اس کو فریب ساتھ لیا　　دل کو عاشق کے اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ اس نے یہ ٹھانی　　کیجیے اس سے دشمنی جانی
یہ تو دل تفتۂ محبّت تھا　　سخت وارفتۂ محبّت تھا
وقت نزدیک تھا کہ آپہنچا　　تا لبِ آب پا بہ پا پہنچا

آب کیسا کہ بحر تھا ذخّار　　تند، مواج، تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنارہ طوفاں پر　　مارے چشمک حباب عماں پر

ہم کنار بلا ہر اک گرداب　　لجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گزر موج جب نہ تب دیکھا　　ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اِک آن کر ہوئی موجود　　ہو فلک پر ہلال جیسے نمود

کی کنارے پر لاکے استادہ　　تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے پہ جلد جا پہنچا　　یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا

بیچ دریا کے دایہ نے جا کر　　کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر اک بار　　اور بولی کہ او جگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش　　موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اس کو　　چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو

اُس طرف آب کی اُترنا ہے　　اس نواحی کی سیر کرنا ہے

پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود　　ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود

جس کفِ پا کو رنگِ گل ہو بار　　منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو　　مفت ناموس عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام　　کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سن کے یہ حرف دایۂ مکّار　　دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کار عشق کی تہ سے　　جست کی اس نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں　　موج زنجیر ہو گئی پا میں

کھنچ گیا قعر کو وہ گوہرِ ناب
کشش عشق تھی مگر تہ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
یوں جو ڈوبے کہیں نکلتے ہیں

یوں جو ڈوبے کہیں تو جا نکلے
غرق دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اس کو
رفتہ رفتہ ڈبو دیا اس کو

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں
کھو گیا گوہرِ گرامی جاں

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
واں سے کشتی چلی برنگ باد

خار خارِ دلی سے فارغ ہو
لے گئی پار اس گل نو کو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشق بے دل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسر گر
لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عشاق گر گئے ناشاد
خاک خوباں بھی اس نے دی برباد

قصہ کوتاہ بعدِ یک ہفتہ
آئی وہ رشک مہ زخود رفتہ

لگی کہنے کہ اب تو اے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرو مایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزو مند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد
ساتھ اس کے گئے وہ شور و فساد

شور و فتنے تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں گئیں بارے

مجھ کو گھر بن نہیں ہے اب آرام
دل کو شام و سحر ہے رنج تمام

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشتِ طبع روز افزوں ہے　　حالِ دل کا مرے دگرگوں ہے

بے دماغی کمال ہوتی ہے　　جان تن کو وبال ہوتی ہے

دل میں آتا ہے ہوں بیابانی　　پھر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے　　طاقتِ دل جواب دیتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہووے گا　　آج کل میں جنون ہووے گا

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر　　ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو　　ورنہ کیا جانیے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز　　حُسن کا در پہ تیرے روے نیاز

اب تو فتنے کو میں سلایا ہے　　اس بلا کے تئیں ڈُبایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا　　سدِ رہ کون ہے نکلنے کا

ہو محافے میں دل خوشی سے سوار　　شاد شاداں کر آب سے تو گزار

دل سے اپنے پدر کے غم کم کر　　مادرِ مہرباں کو خُرّم کر

کر ملاقات ہم دموں سے تو　　گرمِ بازی ہو محرموں سے تو

یہ نہ سمجھی کہ بد بلا ہے عشق　　گھات میں اپنے لگ رہا ہے عشق

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے　　عاقبت اس کو مار رکھتا ہے

جذب سے اپنے جب کرے ہے کام　　عاشقِ مردہ سے بھی لے ہے کام

صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید　　اس جگہ سے رواں ہوئی نومید

پہنچی نصف النہار دریا پر　　روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی　　دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش — تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش
تجھ کو آیا نظر کہاں جاکر — پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جاکر
مجھ کو دیجو نشان اس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیرِ آب — ناشناسائے موجہ و گرداب
لجہ کیا موج کس کو کہتے ہیں — گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہے میسّر کہاں یہ سیرِ عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق — ہے یہ بہ پارہ ناشکیبِ عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند — کچھ نہ تھا پھر سراب کی مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کے — گر پڑی قصد ترکِ جاں کر کے
موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ — لپٹی اس کو بہ رنگ مار سیاہ
دامِ گستردہ عشق تھا تہِ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے — نورِ مہتاب جیسے لہراوے
تھی وہ اس کی حنائی انگشتاں — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کششِ عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
کودے غوّاص و آشنا سارے — تا بمقدور دست و پا مارے

کھینچ کر کوفت سب ہوے بے تاب　　نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
جا ہم آغوشِ مردہ یار ہوئی　　تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی

پاک کی زندگی کی آلایش
ہو کے دست و بغل کی آسایش

سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ　　آفتِ تازہ لے گئی دایہ
اَب و عم مادر و برادر سب　　خاک افشاں بہ سر و نالہ بہ لب
دار و دستہ تمام اس گل کا　　ترک آئین کر تجمّل کا
سوے دریا رواں ہوے گریاں　　آتشِ غم سے دل جگر بریاں
خلق اک جا ہوئی کنارے پر　　حشر برپا ہوا کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا　　آخر اِن کو اسیرِ دام کیا
نکلے باہر و لے موے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا　　مر گئے پر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں　　ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے
مل رہے تھے وہ دونوں وصلی وار　　ہم دِگر سے جدا ہوے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے اُن کا فصل　　جان دے دے ہوا ہو جن کا وصل
حیرتِ کارِ عشق سے مردم　　شکل تصویر آپ میں تھے گم
میر اب شاعری کو کر موقوف　　عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے　　اُس سے جو کچھ کہو سو آتا ہے

کتنی وسعت ترے بیان میں ہے
کتنی طاقت تری زبان میں ہے
لب پہ اب مہرِ خامشی بہتر
یاں سخن کی فراموشی بہتر

(۲)

شعلۂ عشق

تمہید

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور — نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب، محبت سبب — محبت سے ہوتا ہے کار عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی — محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے — محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ — محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبت ہے آبِ رُخِ کارِ دل — محبت ہے گرمیٔ بازارِ دل

محبت اگر کار پرداز ہو — دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

محبت عجب خوب خوں ریز ہے — محبت بلائے دل آویز ہے

محبت کی ہیں کار پردازیاں — کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل — نہ ہووے محبت تو پتھر ہے دل

محبت کی ہے اس گلستاں میں راہ — کلی کے دلِ تنگ میں بھی ہے چاہ

محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے — محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ — محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظام جہاں — محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے روتے گئے یار خوں — محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں

محبت سے ہوتا ہے جو کچھ کہو — محبت سے وہ ہو جو ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بہ جاں — محبت سے بلبل ہے گرم فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز — اسی کے لیے گل ہیں سرگرم ناز

محبت ہی ہے تحت سے تا بہ فوق — زمیں آسماں سب ہیں لبریز شوق

محبت سے یاروں کا ہے رنگ زرد — دلوں میں محبت سے اٹھتا ہے درد

گیا قیس ناشاد اس عشق میں — گئی جانِ فرہاد اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ — کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا — نل اس عشق میں کس طرح سے موا

جو عذرا پہ گزرا وہ مشہور ہے — دمن کا بھی احوال مذکور ہے

ستم اس کے سارے یہ سہتے گئے — اور اس عشق کو عشق کہتے گئے

اس آتش سے گرمیٔ خورشید ہے — یہی ذرے کی جانِ نومید ہے

اسی سے دلِ ماہ ہے داغ دار — کتاں کا جگر ہے سراسر فگار

نئی اس کی ہر جا حکایت سنی — گہے شکر و گہ ہے شکایت سنی

اسی سے قیامت ہے ہر چار اور — اسی آفت فتنہ گر کا ہے عالم میں شور

کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں — نہ ہو اس سے آشوب محشر عیاں

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی — کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار

غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصہ جاں کاہ کہ در عہد شاہ محمد عظیم بہادر بظہور پیوستہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا — عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پسر آم نام — خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام

جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ — گلستاں پہ کام اس کی خوبی سے تنگ

جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ — چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ

جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو — قیامت اُدھر سے نمودار ہو

کھلے بال چلتا وہ جو سرو ناز — قدم بوس کو آتی عمر دراز

نگاہ گرم اس کی جدھر جا لڑی — کہے تو کہ اُس طرف بجلی گری

وہ کافر بھویں ہووے مائل جہاں — کریں سجدہ اُس جا پہ اسلامیاں

نگاہ تیغ مجروح جس پر پڑے — پلک سیلِ خوں دل میں جا کر گرے

سیہ چشم اس کی وہ بدمست تھی — نگاہوں سے شمشیر در دست تھی

رخ اس کا کہاں اور مہ و خور کہاں — تفاوت زمیں آسماں کا ہے یاں

وہ لب لعل گو جن سے شرمندگی — دم حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجیے — تو آگے سخن مختصر کیجیے

نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں رہیں — سبھی دست زیر زنخداں رہیں

سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے — وہیں ہوئے مقصودِ جاں دیکھیے

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے
قیامت تھی واں نالہ و آہ سے

فدا اس پہ جی جان ہر ایک کا
کہ مقصود دل تھا بد و نیک کا

کئی گرد و پیش اس کے وارفتگاں
کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں

بہت رفتگانِ ادائے کلام
بہت مبتلائے بلائے خرام

کوئی والۂ خندۂ برق وش
کسو کے تئیں جنبش لب سے غش

کوئی کشتہ تھا شوقِ رفتار کا
کوئی نیم جاں ذوقِ دیدار کا

کسو کی نظر میں کمر کی لچک
کسو کے جگر میں پلک کی کسک

کوئی حیرتی طرزِ گفتار کا
کوئی آرزو کش تھا پیکار کا

کوئی زلف سے اس کی مجنوں رہے
کسو کا تبسم سے دل خوں رہے

کوئی دل ستم کشتۂ یک نگاہ
کوئی جاں ہونٹوں پہ موقوف آہ

کسو پر فسوں گردشِ چشم کا
کسو پر غضب ناز اور خشم کا

کوئی دست بر دل کوئی بے قرار
کوئی بے خبر کوئی بے اختیار

انھوں میں سے اک عاشقِ زار تھا
اس آفت سے اُس کو سروکار تھا

محبت میں تھا جذبہ کامل اُسے
مرادِ دل اپنی تھی حاصل اسے

شب و روز ہم بستر کام دل
ہمیشہ ہم آغوشِ آرام دل

دم اس کے ہیں یاں تک تو تاثیر تھی
کہ صحبت اُس آتش سے درگیر تھی

بہم ربط چسپاں بہم اختلاط
نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط

مرے کوئی غم سے کوئی ہو ہلاک
وہ شعلہ اسی خس سے رکھتا تپاک

کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس
یہ صحبت سنی ہے خلافِ قیاس

بہت ہی بہت اُس سے مالوف تھا
اسی کی تسلی میں مصروف تھا

کہ ناگہ وہ دل بر ہوا کدخدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جدا

زن و شو میں اخلاص باہم ہوا
اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا

نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں
سخن سے وفائیں تراوش کریں

ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر
کہ دشوار اُٹھے ہم دگر اک نظر

رہیں دونوں دست و بغل روز و شب
کبھو منھ پہ منھ اور کبھو لب پہ لب

وفا کی تکالیف سے ایک روز
گیا اپنے عاشق کے گھر دل فروز

کئی دن میں جا کر جو اس سے ملا
کیا اس نے حد سے زیادہ گلا

کہ اے نازنیں آہ کس نے کہا
کہ تو حال سے میرے غافل رہا

مگر سدِ رہ تھا کسو کا فریب
ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب

کوئی زلف زنجیرِ پا ہو گئی
کہ مسدود راہ وفا ہو گئی

طرح کس کی چتون کی دل میں کھبی
جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی

کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا
مرے جامِ عشرت میں لو ہو کیا

کہا اس نے تھی کدخدائی مری
نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری

رکھ اب مجھ کو معذور ناچار ہوں
محبت کا میں تو گرفتار ہوں

نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام
طرف اس کے ہے دل کو میلِ تمام

اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے
دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے

اُسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی
وہ رہتی ہے بے طاقت عاشقی

نہیں اس کو یک لحظہ تابِ فراق
جدائی مری اُس پہ گزرے ہے شاق

نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن
تو پاتا ہوں جاکر اسے نیم جان

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاے وہ
وہیں اپنے جی سے گزر جاے وہ

جو پہنچے مری جھوٹ اُسے یہ خبر
تو کر بیٹھے سچ اپنے جی کا ضرر

غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں
شکیبائی ہجر بالکل نہیں

یہ سن کر کہا اس دل افگار نے
ستم کشتۂ دوریٔ یار نے

کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول
یہ مکرِ زناں ہے تو ان پہ نہ بھول

وفا کن نے ان ناقصوں میں سے کی
ہوا شوی کس کا کہ پھر وہ نہ جی

یہ ظاہر میں ہر چند ہوں رشک ماہ
و لیکن ہیں باطن میں مارِ سیاہ

خدا کر سے ان کے دی ہے خبر
نہیں اُن سے کوئی فریبندہ تر

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے
زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر کیا تاکہ جا اُس کے گھر

کہے غرق دریا ہوا پُر سرام
ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقت سحر
سو ڈوبا وہ خورشید روشن گہر

کیا موج دریا نے سر سے گزار
اٹھا طبع نازک سے اس کے غبار

وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب
سو اب موج دریا کو ہے پیچ و تاب

پھریں تھیں جو وہ انکھڑیاں آب میں
سو وہ گردشیں اب ہیں گرداب میں

تمنا میں تھے جس کی سب دل فگار
سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار

نا سمجھا وہ نافہم اسرارِ عشق
نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق

کہا، غرق دریا ہوا پرسرام
ہوا کام اس رشکِ مہ کا تمام

کہے تو، کہ موجوں کو تھا انتظار
کہ دست و بغل ہو گئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب
کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے
بہ حالِ خراب ایک جمہور ہے

گرے ہیں کئی آشنا آب میں
کئی آتشِ غم سے ہیں تاب میں

کوئی سر پہ اس غم سے ڈالے ہے خاک
کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

ہمیں داغ وہ دُرِ تر دے گیا
بہت آب یہ ماجرا لے گیا

سُنا اس کے ہم سر نے جب یہ سخن
ہوا موج زن بحرِ رنج و محن

نگاہ اس طرف در کے مایوس کی
دمِ سرد کھینچا، گیا ڈوب جی

وہیں بے خودی رخصتِ جان تھی
وہ اک دم کی گویا کہ مہمان تھی

گری ہو کے بے جان، وہ درد مند
ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

موئی غم سے اس یار طنّاز کے
گئی جان ہم رہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا، دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اس کنے زود تر
جو تھا در پئے امتحاں بے خبر

کہ وہ رشکِ مہ امتحاں دے گئی
محبت کی ناموس کو لے گئی

موا سُن پرسرام کے تئیں موئی
مِرے اک سخن میں قیامت ہوئی

اگرچہ نہ کچھ منہ سے اُس نے کہا
دیا جی، و لے جی اسی میں رہا

یہ سُن کر وہ نافہم حیراں ہوا
خجالت سے سر در گریباں ہوا
گیا ہوش سُن کر پرِ سرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا
اٹھا بے خود و بے خرد، بے حواس
گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس
لگا کہنے اے مایۂ زندگی
مجھے منہ سے تیرے ہے شرمندگی
کیا جلد رخصت سفر تو نے بار
نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار
نہ میری سنی کچھ، نہ اپنی کہی
مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی
زمیں پر سے آخر اٹھایا اُسے
لبِ آب جا کر جلایا اُسے

جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی
محبت عجب داغ دکھلا گئی

یہ سر گرمِ فریاد و زاری ہوا
لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا
جگر غم سے یک لخت خوں ہو گیا
رُکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا
گئے ہوش و صبر اس کے یک بارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی
سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا
نہ جی کو تسلی، نہ دل کو قرار
کفِ غم میں سر رشتۂ اختیار
کبھو یاد کر اس کو نالاں رہے
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے
نہ اک آن وہ دیدۂ تر لگے
نہ گھر میں لگے جی، نہ باہر لگے
کبھو یاں، کبھو واں، بہ حالِ خراب
وہی بے قراری، وہی اضطراب
رہے گھر تو آشوب گاہ وہ گلی
چمن میں جو لے جائیں تو بے کلی
کبھو متصل ہونٹھ پر آہِ سرد
کبھو دست بر دل، کہ ہے دل میں درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بد و نیک کی سدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جا کے صحرا سے لاویں اسے
کبھو روتا دریا پہ پاویں اسے

کبھو خاک ملتا ہے منھ پر کھڑا
کہیں ہے خرابے میں بے سدھ پڑا

سرِ شام اک روز دریا گیا
ہوئی شام، واں سے نہ آیا گیا

کنارے پہ رہتا تھا اک دام دار
رہا رات اس کے یہ قرب و جوار

کہا اس کی عورت نے اس رات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں
تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں

ترا شب کو پڑتا تھا دریا میں دام
تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام

تو جاتا نہیں شب کو جس روز سے
معیشت ہے اندوہ جاں سوز سے

نہیں طاقتِ صبر ہم کو تنک
بہت دیر ملتا ہے نان و نمک

وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں
بہت تنگ دستی سے حیران ہوں

کہوں کیا کئی روز سے شام کو
اٹھاتا نہیں اس سبب دام کو

کہ اک شعلۂ تند پُر پیچ و تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیک آب

کوئی دم تو رہتا ہے سرگرمِ گشت
کبھو سوئے دریا کبھو سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پرسرام تو ہے کہاں

یہ آتش مرے دل کی کیونکر بجھے
عدم میں بھی میں نے نہ پایا تجھے

کیا عشق نے مجھ کو آتش کا باب
نہ چھڑکا مری آگ پر تو نے آب

یہ کہہ کر وہ جاتا ہے سوئے سماں
رہے ہے مجھے رات دن خوفِ جاں

سُنا حال شعلے کا صیّاد سے — دھواں اک اُٹھا جانِ ناشاد سے

ہوا شعلۂ شوق دل سے بلند

رہا لوٹتا آگ میں جوں سپند

گئی رات جوں توں ہوئی صبح جب — زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب

محبت نے کی اشتعال ک کہ وہ — سراسیمہ آیا چلا اس جگہ

جہاں سے اٹھی تھی یہ آتش سلگ — پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ

تبسم کناں واں پہ آکے کہا — کہ کلفت میں غم کی بہت میں رہا

نہ ہوتیں جو دل گرمیاں متّصل — نہ ہوتی یہ آتش کبھو مشتعل

چلو سیر کشتی کو ہنگامِ شب — لبِ آب خالی کریں دل کو سب

ہوا سو ہوا یوں ہی تقدیر تھی — جہاں سوزِ الفت کی تاثیر تھی

کہاں عقل کی ان نے باتیں جو واں — وہ عاشق جو تھا درپے امتحاں

لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے — کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے

سو یہ دن خدا نے دکھایا مجھے — سخن تیرے لب کا سنایا مجھے

ندامت سے ہوں تنگ شاید ہیں سب — گرفتار ہوں میں یہ حال عجب

نہ خجلت سے منھ ہے کہ میں کچھ کہوں — نہ قدرت اجل پر کہ مرہی رہوں

نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب — نہ جانا کہ اتنی ہے وہ ناشکیب

ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب — خرابی کا تیری ہوا میں سبب

کروں گا زمانے میں جب تک معاش — رہوں گا اسی درد سے دل خراش

مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ — کہ آیندہ رہیے تری خاک رہ

زمانے میں جب تک جیا کیجیے　　رضامندی تیری کیا کیجیے

جو اس میں ہے خوش تو تو ہوں میں بھی ساتھ　　رہیں گے لبِ آب ہی آج رات

دلِ پُر کو خالی کریں گے بہم　　پھریں گے ترے ساتھ خوش کوئی دم

ہوے عاقبت سوے دریا رواں　　نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں

کہ آگ سلگی ہے واں بر کنار　　محبت کمیں میں ہے سرگرمِ کار

کسو اشتعالک کی ہے منتظر　　جہاں سر کو کھینچا قیامت ہی پھر

ہوے ناو پر شام کو جب سوار　　کہا اس نے یاں ایک ہے دام دار

جہاں قفل ہو راہِ دریا تو واں　　کفایت ہے اس کی کلیدِ زباں

اسے ساتھ لو تو بھلی بات ہے
کہ دریا میں پھرنا ہے اور رات ہے

لیا آخر الامر ہمرہ اُسے　　بٹھایا قریب اپنے کہہ کہہ اُسے

تنک دور چل کر کیا یہ سوال　　مجھے ہے ترے حرفِ شب کا خیال

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں　　کدھر پیچ و تاب کے کھاتا ہے یاں

کہاں لے ہے دریا پہ اک دم قرار　　کدھر مضطرب ہو کرے ہے گزار

ٹھہرتا ہے کس جا وہ آتش فگن　　طرف کون سے ہو ہے گرمِ سخن

یہ صیاد سے تھا ہی محوِ سُراغ　　جگر آتشِ شوق رکھتا تھا داغ

کہ ہو کم فروغ اک سوے آسماں　　تڑپنے لگا جیسے آتش بہ جاں

کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود　　ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود

لبِ آب وہ شعلۂ جاں گداز　　تڑپ کر بہت بازبانِ دراز

پکارا کہاں ہے پرسرام تو | محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
کہ میں جملہ تن آتشِ تیز ہوں | دلِ گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑک گئی ہے جب آگ دل کی مرے | لبِ آب آ اتروں ہوں غم میں ترے
مگر سوزشِ دل ہو کم آب سے | بجھے جی مرا اس تپ و تاب سے
سو یہ آب کرتا ہے روغن کا کام | کیا عشق نے مجھ سے دشمن کا کام
یہ شعلے سے سُن کر ہوا بے قرار | سفینے سے اُترا بصد اضطرار
ہوا ہم دم اس آتشِ تیز سے | کہا اس بلا سے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرسرامِ خانہ خراب | مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے | یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برقِ خرمن ہوئی | تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا | کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرم جوشی سے یک جا ہوئے | کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ جو تھا ایک جا مشتعل | کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
یکا یک بھڑک کر وہ جلنے لگا | پھرا یدھر اُدھر جلنے پھرنے لگا
کیا پاس پانی کے آکر صعود | رہی روشنی سے کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا | نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
خبردار ہو اہلِ کشتی تمام | لگے کہنے باہم نہیں پرسرام
اٹھے ڈھونڈھنے ہو کے سب ناصبور | کنارے پہ دریا کے نزدیک و دور
نہ پایا کہیں اس کو حیراں ہوئے | نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے

وہ صیاد بولا کہ دوں میں نشاں
گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں

یہ اور آگ دونوں ہوئے ہم سخن
وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن

یہ جوشش تو یاں سے تھی مدنظر
پھر آگے نہیں اس کی مجھ کو خبر

نہ ہو آتشِ غم سے پہلے ہی داغ
چلو اس طرف کو جو نکلے سراغ

گئے مضطرب حال سارے وہاں
تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں

بہت کی تلاش اس کی لے لے کے نام
پکارے بہت پر کہاں پر سرام

محبت نے ایسا کھپایا اُسے
کہ ہرگز کسی نے نہ پایا اُسے

ہوئے ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے نیم جاں
نہ پیدا ہوا صبح تک کچھ نشاں

یقیں ہو گیا سب کو وہ تیز آگ
ابھی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ

لپیٹ اس کو شعلہ ہی وہ لے گیا
عجب طور کا داغ وہ دے گیا

پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب
کسی کو تحیر کسی کو عجب

کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا
کوئی برلبِ آب جانے سے تھا

خصوصاً وہ بے دل ہوا پُرخجل
ندامت ہوئی یہ جیسے منفعل

نہ تھا اگلی خجلت ہی سے روئے حرف
ہوا دوسرا ماجرائے شگرف

تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا
کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا

کہ پوچھیں گے جو اس کے واماندگاں
تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیاں

کہوں کیونکہ یک بار وہ جل گیا
کفِ خاک ہو خاک میں مل گیا

کھینچی جرم کو بے گناہی مری
ہوئی شہر میں روسیاہی مری

وہ شعلہ جلاتا مجھے کاش کے
لیے ساتھ جاتا مجھے کاش کے

اگرچہ یہ قصّہ ہے حیرت فزا — ولے میرؔ یہ عشق ہے بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے — بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر — جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

---

(۳)

اِعجازِ عشق

تمہید بہ حمدِ باری تعالیٰ

ثنائے جہاں آفریں ہے محال
زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال

کمالات اس کے ہیں سب پر عیاں
کرے کوئی حمد اس کی سو کیا بیاں

کہوں اس کی کیا میں صفاتِ کمال
کہ ہے عقلِ کل یاں پریشاں خیال

خرد کُنہ میں اس کے حیران ہے
گماں یاں پریشاں پشیمان ہے

زمین و فلک سب ہیں اس کے ظہور
مہ و خور ہیں اس ہی سے لبریز نور

یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے

نہ آوے کسو کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں

بری ہے گا تمثیل و تشبیہ سے
منزہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے

وہ ہے حاصلِ مزرعِ آسماں
کیے اُن نے دانوں میں خرمن نہاں

سفید و سیاہ کو نہیں اس کی بار
ورے ہیں زمانے کے لیل و نہار

دربیانِ توحید

سوا اس کے نقصاں ہے گر دیکھیے
کمال اس کے ہی ہیں جدھر دیکھیے

کہ سر رشتہ ہے خلق کا اس کے ہاتھ
وہ شب باز ان پتلیوں کے ہے ساتھ

سبھوں میں نمود اس کی ہی شان ہے
یہ قالب ہیں سارے، وہی جان ہے
گل و غنچہ و رنگ و بو و بہار
یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار
اگرچہ ہے یاں طرحیں سب کی جدا
یہ سب طرحیں ہیں ایک، نام خدا
سما، ارض و خورشید یا ماہ ہے
جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
نظر کر کے ٹک دیکھ ہر جا ہے وہ
نہاں و عیاں سب میں پیدا ہے وہ
بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں
اسی کے یہ سب عکس پڑتے ہیں یاں
ملک جن و حیوان جماد و نبات
جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات
وجود و عدم اس سے دونوں ہے شاد
وہی ہے گا مبدا، وہی ہے معاد
مجھے ساقی دے کوئی جامِ عقیق
ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق
رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے
کہ درپیش ہے نعت احمد مجھے

در نعتِ حضرت سیّدُ المرسلین

ثنا جان پاکِ محمدؐ کے تئیں
درود و تحیّات احمدؐ کے تئیں
رسولِ خداؐ و شہِ انبیاؐ
زہے حشمت و جاہ اصلِّ علے
دیا مجلسِ کبریا کا ہے وہ
شرف دودمانِ قضا کا ہے وہ
سب اس صفحے میں ہیں ظہورِ خدا
پر اس سے عبارت ہے نور خدا
جہاں وہ ہے، واں جبرئیلِ امیں
اڑے حشر تک تو پہنچتا نہیں
کروں اس کی قربت کا کیا میں بیاں
کہ تھا قاب قوسین او ادنیٰ مکاں

ترے زیرِ پا میرا فرقِ نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز

بہ صورت اگر عبد مشہود ہے — حقیقت کو پہنچو تو معبود ہے

نہیں پا شکستوں کا کوئی دستگیر — محمدؐ بن اور آلؑ بن اُس کے نمیر

گنہگار ہوں چشم لیک اس سے ہے — توقع شفاعت کی لیک اُس سے ہے

پلا ساقیا بادۂ لعل گوں — کہ ہو جائیں سرخ آنکھیں مانند خوں

ہے اب حرف مستانہ کا دل میں جوش
کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

در مناجات عشق

مرا زخم یارب نمایاں رہے — پس از مرگ صد سال خنداں رہے

رہے دشمنی جیب سے چاک کو — صبا دوست رکھے مری خاک کو

مژہ اشکِ خونیں سے سازش کرے — غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے

جگر سے تپیدن موافق رہے — مِرا دردِ دل مجھ پہ عاشق رہے

مژہ گرم آنسو سے نم ناک ہو — کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو

کرے نیزہ بازی یہ آہِ سحر — کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر

خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو — اُڑے پر لگا کر مِرا رنگِ رو

نہ مرہم سے افسردہ ہو داغِ دل — شگفتہ رہے یہ گُلِ باغِ دل

سدا چشمِ حیرت سے نسبت رہے — مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے

اگر ضعف ٹک کسبِ طاقت کرے — مری ناتوانی قیامت کرے

مری بے کسی ناز بردار ہو
مروں میں تو مرنے کو تیار ہو

بیاباں میں آشفتہ حالی کروں
کہیں تو دلِ پُر کو خالی کروں

کریں دونوں عالم ملامت مجھے
ڈبو دیویں اشک ندامت مجھے

مرا ہاتھ ہو چاک کا دستِ یار
کہ تا جیب و دامن ہوں قرب جوار

جنوں میرے سر پر سلامت رہے
بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے

بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وا رہی
بھلا دے خضر کو مری گم رہی

جو ہو گرمِ رہ پا سے پر آبلہ
تو ہو جاے سرد آتشِ قافلہ

در تعریف اعجازِ عشق

ارے ساقی اے غیرت آفتاب
کہاں تک پیوں خونِ دل کی شراب

کبھو ساغرِ بادہ کا دید ہو
محرم ہمارا کبھو عید ہو

زہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری

تجھی سے ہے آبِ رُخِ رنگ زرد
تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفّار و دیں دار سے
تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے

تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری
تجھی سے ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے
ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دلِ شاد غم ناک ہے
تجھی سے میرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تو نے کیا ہے شہید
تجھی سے نہ بر آئی میری امید

تجھی سے ہے مجنون صحرا نورد
تجھی سے ہے فرہاد کوہوں یہ مرد

تجھی سے گلو بند ہے خستگی
تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی

تجھی سے ہے وامق کا احوال بد
غرض نیکیاں ہیں تری لاتعد

تجھی سے دلِ عاشقاں ہے کباب
تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں
تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں

تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ
تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں
تجھی پر ہے موقوف جاں بازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا
ولیکن ترا راز رسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے
ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

ترا ہی نمک خوار ہے زخمِ دل
کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل

تجھی سے ہے مژگاں کو یہ ربطِ اشک
کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبطِ اشک

آغازِ داستان

کدھر ہے تو اے ساقیٔ لالہ فام
نہ لغزش ہے تجھ بن نہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خونِ دل کو پیے
کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیے

کسو معتبر سے روایت ہے اک
کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک

کہ اک ملک میں ہیں قضا را گیا
جواں ایک واں مفت مارا گیا

وہ کس طور مارا گیا کیا کہوں
تعجب میں اس کے کہاں تک رہوں

سنو اب جو کچھ اس کے جی پر ہوا
مصیبت زدہ بن اجل کیوں موا

اٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز
پشیمانی اس کی ہے مجھ کو ہنوز

نظر جا پڑی جو مری ایک سو
سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوب رو

فقیرانہ سی جھولی اک اُس کے پاس
بدن میں نہایت مکلف لباس

سر اوپر تھا ہنگامہ اک اس کے جمع
پتنگے اکٹھے ہوں جوں گرد شمع

جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل
کرے جس کی خاکِ قدم غازہ گل

لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا
کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا

اُسی کی سی مقدور تک سب کہیں
سدا اس کا منہ دیکھتے ہی رہیں

وہ اک دودماں کا تھا روشن چراغ
جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ

ولے اس کے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیجے جلا اس سے سارا جہاں

سب آرام چاہیں، اُسے اضطرار
سراپا تلک اک دلِ بے قرار

نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اُس کو تھا
نہ کچھ خوف مر جانے کا اس کو تھا

نہ طاقت تھی تن میں نہ کچھ جی میں تاب
نہ دل پاس، نے صبر و آرام و خواب

سرِ راہ دل قیمہ قیمہ لیے
یہ کہتا تھا مر جائیے، بس جیے

سن اس نو گلِ عشق کی بے کلی
رہا کرتی ماتم سرا وہ گلی

دل و ہوش و صبر و توان و حواس
رہیں اس کی وحشت سے سارے اُداس

نہ ناموس کا ننگ، نے نام کا
مرا دوست دشمن تھا آرام کا

شب و روز فریاد کرنا اُسے
کئی بار اک دم میں مرنا اُسے

تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا
زمانے کو چندے تماشا ہوا

جو دم لے تپش تو شتابی کرے
تسلیٔ دل کی خرابی کرے

کرے طرح داغوں سے وہ باغ کو
روانی اسی سے زرِ داغ کو

کرے پنبہ کو اپنے داغوں سے دور
تو نزدیک ہو رودِ خوں کا ظہور

سحر سُرخ آنسو وہ رویا کرے
رُخِ زرد کو اپنے دھویا کرے

دلِ غم زدہ سے محبّت اُسے
قیامت خوشی سے عداوت اُسے

وہ بے تابیوں سے بہت کم فراغ
کہاں صبر کرنے کا اس کو دماغ

بدن گرد آلودہ بھن بھن کرے
لباس اپنا عُریانیٔ تن کرے

کرے جب تلک وہ گریباں دری
تو دامن کی تب تک کرے دل بری

فراغ اس کو ہو جیب چاکی سے جب
خدا حافظِ حال دامن ہو تب

نہ بھولے مژہ اس کی کاوش کبھی
رہے یاد تا خارِ خارِ دلی

اٹھی اس کے جی سے فغاں کی شرر
رہی پرچھیاں سہتی آہِ سحر

وہ ہر چند ہر صبح کو ہو ملول
ولیکن دعا اس کی کیا ہو قبول

نہ آنسو کو اس کے تھی اس پر نظر
نہ آہِ سحر میں تھا اس کے اثر

کہے رنگِ رو کیوں مرا زرد ہے
رکھے ہاتھ دل پر کہ کچھ درد ہے

کرے اپنی مژگانِ تر پر وہ ناز
کرے اپنے زخمِ جگر سے وہ ساز

وہ کاندھا ہے نعشِ تمنا کے تئیں
کرے تعزیت خانۂ دنیا کے تئیں

سنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے
بیاں اس کا کچھ گو مگو ہی رہے

افشائے رازِ عشق

لے آ ساقی گر بادۂ شوق ہے ۔۔۔ سیاہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے

کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق ۔۔۔ کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق

یہ قصہ جہاں میں فسانہ ہوا ۔۔۔ مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا

ولے گاہ وہ شمع مجلس فروز ۔۔۔ کئی بیتیں پڑھتا تھا یہ سینہ سوز

کہ جن کا یہ مضمون تھا دوستاں ۔۔۔ چلے ہے گی تقریر کرتی زباں

پڑی آتشِ عشق سرکش ہے یاں ۔۔۔ جگر کیوں نہ جل جائے آتش ہے یاں

نظر آ کہیں، جا رہا ہے یہ جی ۔۔۔ کہ آنکھوں میں اب آ رہا ہے یہ جی

زن و مرد کی ہوں زباں سے بتنگ ۔۔۔ ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خونِ دل میں تپیدہ ہوں میں ۔۔۔ کہ آہِ بہ لب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہنچی ہے اے حبیب ۔۔۔ وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب

جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ ۔۔۔ یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

رہا بابِ ذلت میں شام و سحر ۔۔۔ پھرا خاک منھ پر ملے در بدر

نہ سمجھا یہ بھی ہے مرے سر پہ خاک ۔۔۔ کس امید پر میں ہوا ہوں ہلاک

تو جب سے در اوپر نظر آ گئی ۔۔۔ رہیں آفتیں میرے سر پر نئی

نہ نامہ نہ پیغام، نے رسم و راہ ۔۔۔ یوں ہی ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل و دیدہ سب مدعی ہو گئے ۔۔۔ تماشائی مجھ پر بہت رو گئے

کئی بار جاں لب پہ آ پھر گئی ۔۔۔ کہاں ہے تو اے گل، ہوا پھر گئی

یہ حیران ہوں، صبر آتا نہیں
تصور ترا جی سے جاتا نہیں

خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد
کہ جس سے ہوا جاے ہے رنگ زرد

رہا کرتی ہے داد بے دادیاں
دلِ شب سے گزرے ہے فریادیاں

سرِ رہ ٹک آ دیکھ یہ خستہ حال
کہ ہوں نقشِ پا کی طرح پائمال

ترے درد و غم میں ہیں جوں کیمیا
سنا ہی کیا نام مہر و وفا

نہ آنا نظر بھی ادا ہے ولیک
نہ اتنا کہ جاتا رہا جی سے ایک

ترے غم میں اے آفتِ روزگار
ہزاروں بلائیں ہیں یاں روبہ کار

کہاں ہے تو محمل نشینِ حیا
سرِ راہ نالاں ہوں مثلِ درا

کہہ اس طرز پر حال دل کا تمام
خموشی کو پھر ان نے فرمایا کام

غم خواریٔ درویش

کہاں ہے تو اے ساقیٔ گل عذار
کہ دے مجھ کو جامِ مے خوش گوار

لکھوں قصۂ عشق بے کیف و کم
قلم بے خودانہ کرے کچھ رقم

مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی
کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی

گیا زہرۂ تابِ دل آب ہو
کہا آگے جا کر میں بے تاب ہو

کہ اے ناز پروردِ مہر و وفا
کوئی اپنے جی پر کرے ہے جفا

مثل ہے کہ جی ہے تو ہے گا جہاں
وگرنہ موے پر ہے کیا میری جاں

تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی
نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی

تہِ دل ہو معلوم تا بول ٹک
سخن حسرت آلود کہنے یہ آ
تو مہرِ خموشی کو اب دور کر
وگرنہ تو رک رک کے مرجائے گا
تو ہے صرصرِ غم سے آتش بہ جاں
تو اے شمع خامش زباں ٹک ہلا
تو کس آتشِ تند پر ہے سپند
جلاتی ہے آتش تری میرے تئیں
ترے سوزِ دل نے جلایا مجھے
ترے داغ آتش کدہ ہوں نہ کیوں
گھٹا پاتے ہیں تجھ کو ہر صبح و شام
ترا دردِ پنہاں ہے گو آشکار
کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ
جہاں تو مجھے بھیجے واں جاؤں میں
جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار
خدا جانے کیا جی میں بات آگئی
یہ سن کر جوانِ زخود رفتہ نے
کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
سخن ہونے لاگے نمودار کچھ

تو مژگانِ خوں بستہ کو کھول ٹک
کچھ اِک دل کی باتیں زباں پر بھی لا
سخن خوں آلودہ مذکور کر
یہ ہے عشق، کام اپنا کر جائے گا
دیا سا نہ بجھ جائیو اے جواں
کہ کس مجلس افروز سے تو جلا
ترا دودِ دل یہ ہوا ہے بلند
کیا داغ کس شعلہ نے تیرے تئیں
ترے دل کی آتش یہ کیوں کر بجھے
پہ یہ کہہ بھبوکا بجھا سا ہے کیوں
نہ کاہیدہ ہو تو اے ماہِ تمام
پہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں رازدار
کہوں اس سے جا کر غمیں تو نہ رہ
کہے کار جو تو بجا لاؤں میں
کروں میں ملک کی طرح واں گزار
کہ میری یہ دل جوئی ہی بھا گئی
جگر سوختہ اور دلِ تفتہ نے
زباں تاب کھانے لگی جیسے دود
لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوے مستفاد
کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد

جو دل جوئی میری ہے مدِ نظر
تو یاں اک محلہ ہے ٹک قصد کر

نہیں اس کو درکار کچھ جستجو
سرا ایک ترسا کی ہے قبلہ رو

زباں سے مری در پہ یہ جا کے کہہ
کہ احوال سے میری غافل نہ رہ

ترے واسطے خوب رسوا ہوا
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا

ترے سوزِ دل نے جلایا مجھے
مرے دل کی آتش یہ کیوں کر بجھے

تسلّی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب تابِ تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب و تواں
اٹھایا تحمل کا بارِ گراں

پیغامِ عاشق و جوابِ معشوق

شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق
کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق

ہوا آخر اب دل کا سب خونِ ناب
پیوں کب تلک اک گلابی شراب

کہے سے جواں کے غرض قصد کر
گیا بندہ ترسا کے دروازے پر

سُن آوازِ دستک کی اک رشکِ حور
مہِ چاردہ سے نپٹ باشعور

دو چار آکے مجھ سے ہوئی ایک بار
گیا جس کے دیکھے سے صبر و قرار

ہوئی دیکھنے سے جب حقیقت عیاں
کہا میں کہ آخر بشر تھا جواں

بشر کیا ہے دیکھ ایسی آفت کے تئیں
فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کے تئیں

کہا میں نے پیغام جو آیا جن
یہ خوبی سے اس کے کروں کیا سخن

مژہ بخت عاشق کی برگشتگی — نگاہ ایک عالم کی سرگشتگی

قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں — قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں

وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی — قیامت بھی آتی جلو میں چلی

ہیں سودائی اس زلفِ تاریک کا — ہر اک مو سببِ رنج باریک کا

شکن اس کے کاکل کی دامِ بلا — ہر اک حلقۂ زلف کامِ بلا

بھوؤں کی کمانوں سے لگ زلفِ تار — الٹتے تھے اڑ اڑ کے جوں تیر مار

اگر ابرو اس کی جھک جائے تھی — مہِ نو کی گردن ڈھلک جائے تھی

ہلے اس کی ابرو جدھر کرکے ناز — کرے اس طرف ایک عالم نماز

کماں اس کی ابرو کی عاشق کمیں — خدنگ اس کے مژگاں کے سب دل نشیں

نہ آنکھوں کی مستی کی اس کو خبر — خرابی نہ عاشق کی مدِ نظر

نگاہ دار تھی سرخیٔ چشم کی — طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی

شہید اس کی چشمک کے دل خستگاں — نشانے نگاہوں کے دل بستگاں

مژہ موجبِ قتل جمع کثیر — غرض سب تھے یہ ایک ترکش کے تیر

چھپیں اس کے غمزے ہیں کتنی سناں — نمایاں ہوئی سب پہ مرگِ جہاں

جبیں کھول دی اس پری زاد نے — کہ چیں مانی خوبانِ ناشاد نے

رواں اس شب افروز سے اشک شمع — یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشک شمع

پری منفعل رنگِ رخسار سے — خجل کبک اندازِ رفتار سے

سوا اس کی باتوں کے سب باتیں ہیں — جسے سن کے مردے بھی جی جاتے ہیں

لبِ سرخ اس کے وہ گل برگِ تر — چھپے جن میں دنداں کے سلکِ گہر

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم
سخن رہ روِ راہِ تنگِ عدم

تبسم تنک گر وہ دل کش کرے
تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے

نہ دیکھا کسی نے تن اس کا صاف
نظر گر نہ ٹھیرے تو رکھیئے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے
مگر صاحبِ دستِ غیب اس کو پائے

کیا ان نے پامال کتنوں کا خوں
حنا اس کے ہاتھوں میں کشتوں کا خوں

نہ رنگِ صفائی فقط تن پہ تھا
کہ مینا کا خوں اُس کی گردن پہ تھا

ادا اس کی عاشق کے جی کی بلا
نہ میری تمھاری ہے سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام
تو معلوم ہے پھر جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آگئی
قیامت ہی گویا اُدھر آگئی

اُسے لغزشِ پا مئے ناز سے
وہ ہووے سر انداز انداز سے

نہ ہووے وہ دل جس میں ہو بے نقاب
چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

ہوئیں طرح اس سے جفاکاریاں
نکالی ہیں اُس نے دل آزاریاں

تُرحم کو پاؤں تلے وہ ملے
ستم اس کے کوچے سے بچ کر چلے

جو آمد ہو اُس کی نصیبِ چمن
کرے ترکِ گل عندلیبِ چمن

زمیں اُس کی یک دستِ گل زار تھی
نسیمِ چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتل گاہِ عجیب
شہادت جہاں ہو سبھوں کو نصیب

وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں
اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں

صبا گر اُڑا دے ذرا واں کی خاک
تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک

کئی ناکہ کش واں کئی نعرہ زن
کئی خوں گرفتہ کئی بے کفن

کئی بے وطن واں سفر کر گئے   بسسکتے ہیں کیتنے کئی مر گئے
ہر اک جان ہر شخص ناکام کی
ہوا دار اس کے لبِ بام کی

جواب طنزیہ و ہلاکتِ معشوق

پھروں ساقیا گرد ہر دم ترے   گلابی ہی منھ کو لگا دے مرے
مجھے مست آب سیہ دے کے کر   چلوں خامہ ساں پھر پے مطلب جدھر
سنا وہ جگر سوز پیغام جب   کیے آشنا حرف سے لعلِ لب
پڑھی اک رباعیٔ نہ کر اعتنا   کہ مضمون جس کا یہ موزوں ہوا
کہ ہجراں میں جو بے قراری کرے   سرِ راہ فریاد و زاری کرے
نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو   بھلی موت ایسے فرومایہ کو
محبّت کی راہ میں یہ پہلا ہے گام   کہ ہر سے گزر جائیے شاد کام
نہیں شرط الفت میں چینِ جبیں   اگر پیش آوے دمِ واپسیں
جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ   وہ ہے غم میں واماندۂ قافلہ
نہ جو ہو سکے ہجر کا پائمال   تو بہتر ہی ہونا ہے اس کا وصال
گیا میں جواب اس کا لے کر اُدھر   سرِ رہ تھا پامال غم وہ جدھر
حقیقت بیاں کی میں اس جائے کی   جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی
گئی ساتھ اس ہائے کے اُس کی جاں   گرا خاک پر ہو کے بے دم جواں
تکے تھا مگر رہ سفر کر گیا   کہ اک بات کی بات میں مر گیا

نہ دیر اس کو ہوتے ہوی جی سے سیر
مجھے بات کے کہنے لاگی بھی دیر

مری بات میں خونِ بلبل ہوا
دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا

میں یہ واقعہ دیکھ گھبرا گیا
کہ یوں یہ گلِ تازہ مرجھا گیا

نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس سوا
کہ کریے بیاں طرفِ ثانی سے جا

ملامت کروں اس کو میں اک جہاں
کہ اے بے حقیقت گئی اس کی جاں

ترے نازِ بے جا کا تو کیا گیا
پر اک بے گناہ اس میں مارا گیا

رہی گھر میں خوبی پہ تجھ کو نظر
سر رہ گیا ایک جی سے گزر

کفِ خاک اس کی ہے ذلت کا باب
تری آستاں کی ہے مٹی خراب

یہ ٹھیرا، میں اودھر روانہ ہوا
اِدھر مرنا اس کا فسانہ ہوا

انجامِ کار

پلا ساقیٔ ماہ وش ایک جام
گیا کاستن ہی میں ماہِ تمام

کہاں ہے وہ خونِ کبوتر سی مے
کہ پی کر فغاں کیجیے مثلِ نے

غرض جوں توں کر قطع میں راہ کی
گیا، تھی جہاں منزل اس ماہ کی

دی آواز دستک کی بارِ دگر
ہوی گھر میں القصہ میری خبر

درِ خانہ پر آئی اک پیر زن
لگی کرنے عشقِ جواں سے سخن

کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تو
شگوفہ مگر اور لایا ہے تو

کوئی رہ گیا تھا پیامِ جواں
جو تو پھر شتابی سے آیا یہاں

بیاں کر جو کہنا ہو تجھ کو شتاب — کہ ہے منتظر غیرتِ آفتاب
کہا میں نے اے پیرزن کیا کہوں — غرض دار اس نوجواں کا میں ہوں
پیام اُس کا لایا تھا میں اس لیے — کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیے
سو یاں سے گیا ایسا لے کر جواب — کہ جس سے نکلتا تھا ناز و عتاب
نہ تھی تاب حرفِ درشت اس کے تئیں — کیا غم نے تھا نیم کشتہ اس کے تئیں
نہ مشغول یوں ہی وہ زاری سے تھا — وہ بے تاب بے اختیاری سے تھا
نہ سمجھی یہ رشکِ پری اس کے تئیں — دکھا ہی دی عشوہ گری اس کے تئیں
چڑھا ان نے تیوری اک انداز سے — کہا بے مزہ ہو کے یوں ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب — شتابی سے مرنا ہے اس کا صواب
ہوا سامنے اس کے میں حرف زن — یہ اُس کی زباں سے کہا میں سخن
جواں سنتے ہی کر کے ایدھر نگاہ — سفر کر گیا جان سے بھر کے آہ
یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں — خبر اس کے مرنے کی لایا ہوں یاں
کہہ اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جاں — گیا آخرالامر جی سے جواں
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا — کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ — لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی — کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبّت نے کام اپنا پورا کیا — کہ اِن دونوں لعلوں کو چورا کیا
فقیر آن کر سخت نادم ہوا — کہ میرے سبب دونوں کا جی گیا
یہ بھی جاے گریہ ہے ساقی! اُٹھا — کہ بدلے گزک کے ہے یاں دل بھنا

تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں
بہ رنگِ گل اب لوٹیے خاک میں

عجب کی نہیں جا نہ کھا پیچ و تاب — یہ میراب جو ہے عشقِ خانہ خراب
سنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا — پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا
عذرا کا ہے مجنوں کی نوحہ پڑا — سیاہ خیمہ لیلیٰ کا بھی ہے کھڑا
گئی جان وامق کی کس رنگ سے — ہوا خاک عذرا کا ہر سنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے اُدھر — دمن ہے بگولا زمیں کے اُوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے — بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں — چراغوں سے اک دودِ دل ہے کشاں
ہے بے تاب ذرّہ اسی سے کباب — جلے ہے اسی آگ میں آفتاب
دل اس داغ سے مہ کا بھنتا ہی ہے — کتاں کا جگر چاک سنتا ہی ہے
سیاہ رنگ اُگتا ہے سرو سہی — وہی رنگ قمری ہے خاکستری
بھنور کے بھی جی پر پڑے گل کہی — کنول کی کھلی آنکھ پھر مند گئی
کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار — خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار
کہیں ساقی دے آب گل رنگ کو — کشادہ بھی کر اس دلِ تنگ کو

گلے لگ کے مینا کے ٹک روئیے
فسانہ بھی آخر ہے اب سوئیے

(۳)

جگر سوز

تمہید

چمن سے عنایت کے بادام وار — الٰہی زباں دے مجھے مغز دار
صفت عشق کی تا کروں میں بیاں — رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں
عجب عشق ہے مرد کار آمدہ — جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا — صف الٹی جہاں ایک مارا پڑا
اگر لوگ مارے گئے سربسر — ولے فتح اُس کی ہے یہ طرفہ تر
کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا — نہ تیغ اس کے تلف ہو گیا
جہاں جس کسو سے اُسے چاہ ہے — وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے
کسی سے اگر ہو گئی لاگ سی — درونے میں اُس کے لگی آگ سی
ہوا ملتفت یہ کسو پر کہیں — تو نام و نشاں اس کا پھر واں نہیں
وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق — پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں — بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں
بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے — بہت خاک مل منہ پہ جوگی ہوئے
گئے دشت میں کچھ نمد مو ہوئے — کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے
نہ مرغ چمن ہی ہے نالاں و زار — گئے داغ کہسار سے لالہ زار
کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا — کسو کو رگن سے جنوں ہو گیا
کوئی زار باراں بہت رو چکا — کوئی برق سا جل بجھا، ہو چکا
غرض عشق کا ہر طرف شور ہے — نئی روز شہروں میں اک گور ہے

بہت جان ناکام دیتے گئے
تمنائے دل ساتھ لیتے گئے

بہت اہلِ اسلام کافر ہوئے
بہت اولِ عشق آخر ہوئے

بہت جرمِ الفت میں مارے گئے
جو اعشق بازی کا ہارے گئے

ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب
جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب

کیا عشق جس دن سے مرتے رہے
جیوں ہی کا اندیشہ کرتے رہے

کسے عشق نے جی سے مارا نہیں
یہی درد ہے درد چارہ نہیں

دوا عشق کی سخت نایاب ہے
سرِ عاشقاں سنگ کا باب ہے

جو ہو عشقِ عارض تو پھر یاس ہے
عبث کوئی دن جینے کا پاس ہے

محبت ہے نیرنگ سازِ عجیب
فسانے ہیں اس کے عجیب و غریب

کوئی عشق کرنا دھرا تھا ورے
گئے میکدے سے بھی صوفی پرے

نہ واں مکر و فے شید و طامات ہے
خرابات جانا کرامات ہے

کہیں عشق نے آرزو کش کیے
گئے خوش جو عاشق ہو ناخوش گئے

کہیں سہل تر یار مرنے لگے
کہیں لوگ دشوار مرنے لگے

کہیں کام اُن نے کیے ہیں عجب
فسانہ ہوئی بزمِ عیش و طرب

کہیں بادشاہ اس سے درویش ہیں
کہیں اس سے درویش دل ریش ہیں

لیا کاہ کا کوہ سے کیں کہیں
ہلائے کہیں آسمان و زمیں

کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد
رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد

یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے
مراد خطر گہ ہے اس شہر سے

ہوئے عشق میں نرہد کیشاں خراب
رہے دل شکستہ پریشاں خراب

اٹھا عشق کا شور عزلت گزیں — گئے دشت گردی کو کر ترک دیں
ہوا عشق سے مجلسِ حالِ دہر — تواجد لگے کرنے مشیخانِ شہر
کیا عشق میں ترک صوم و صلات — گئے اہل مسجد سوے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن — گئے کعبے کو چھوڑ دین کہن
نہ سبحہ نہ زنار نہ کفر و دیں — جہاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
محبت کے ساغر کش اہلِ صلاح — یہ بیہوش دارو ہے ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں — ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں
رباطی ہیں خانہ سبیہ عشق میں — مصلے ہوئے اُن کے تہہ عشق میں
ہمہ خاندانِ تقاوت خراب — خرابے سے ہیں اپنے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہے کام — یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے نام
اسی عشق سے روسیہ روسفید — کہیں عشق سے ناامیداں اُمید
یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ — یہی عشق حلّال مشکل ہے یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف — کہیں ان نے میدان مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے دردِ دیں — کہیں کافرانہ ہوا ہے یقیں

غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز
کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں — کہ افغاں پسر ایک گجرات میں

جواں خوش تھا پرکار و پرہیزگار
بہت حسن کا اس کے واں اشتہار

یہ صورت، یہ طاعت، یہ دامان پاک
نہ دامن یہ مانند گل گردِ خاک

اگر ہووے حورِ بہشتی دوچار
وہ دریائے حسن اس سے ڈھونڈھے کنار

ہو گر آگے اُس کے پری کا گزر
حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر

رہے محوِ پاکیزگی و صلات
نہ ہو ترک سہواً کبھی واجبات

تناسب بہت اس کے اعضا سے خوب
سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب

زباں نرم، طالع وری و صلاح
نہ طنز و کنایہ، نہ رمز و مزاح

خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو
کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو

جوانی کا ہنگام، طاعت کا صرف
لبِ سرخ پر دل بروں کا نہ حرف

حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ
نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ

بہت پاک دامن معیشت ہوئی
نظافت، نزاہت میں مدت ہوئی

کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی

جواں کی نظر شرمگیں جا لڑی
وہ شرمائی، آنکھ اس کے اوپر پڑی

نہ دل مستقل ناشکیبا ہوا
دلِ طرفِ ثانی بھی بے جا ہوا

حیادار تھی زن گئی اپنے گھر
وفادار تھا یہ رہا دیکھ اُدھر

کیا چند شرط وفا ہی کا پاس
لگے رہنے دونوں گھروں میں اُداس

کبھی دن میں ہندو زن آنے لگی
لیے پانی اس راہ جانے لگی

نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا
محبت کا دونوں نے پانی بھرا

یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی
دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی

جیوں ہیں شب و روز مرتے رہے
ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے

رہے دیر تک دونوں ناکامِ عشق
نہ آیا لبوں پر کبھو نامِ عشق

یہ کیا دخل اظہارِ الفت کریں
یہی بستہ لب مشقِ حیرت کریں

گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری
در و بام پر پڑتیں حسرت بھری

لبوں پر نہ آیا کبھو حرفِ عشق
اگرچہ ہمہ تن رہے صرفِ عشق

بجایا کیے پردے میں سازِ دل
نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل

روانوں میں تو گرم جوشی رہی
زبانوں پہ مہرِ خموشی رہی

کریں حسرت آگیں نگاہ چار اُور
لب ان کے یہ ساکت سروں میں یہ شور

کسو سے نہ حرف و حکایت انھیں
محبت سے شکر و شکایت انھیں

کریں دردِ دل سو کبھو زیرِ لب
وگرنہ سکوت ان کو تھا جب نہ تب

شب و روز دونوں تھے صورت مثال
بہم محو خوبی و صرفِ خیال

پیے جائیں آنکھیں بھری بہرِ ضبط
کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط

کبھو آہ اٹھتی تو دم سرد ہو
کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو

دلوں میں جو تھی چاہ خوں ہو گئے
گرفتہ رہے سو جنوں ہو گئے

بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت
کہ تھا شہر میں کام مشکل بہت

ارادے ہوے یہ دلوں میں ہی خوں
کیا پھر بھی دونوں نے صبر و سکوں

صبا سے رہے دو طرف کے پیام
کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام

خیالات ملنے کے جاتے نہیں
قرار و سکوں دل تلک آتے نہیں

شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب
کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر
نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر

پیام ایک کا یہ کہ اے باد نرم
کہ اس کو محبت سے کچھ بھی ہے شرم

تنِ زار بے جان کیونکر جیے
جگر میں نہ ہو خوں تو کیا خوں پیے

ملاقات کا رکھے کیوں کر خیال
رہے کیونکہ جاں نا امیدِ وصال

اگر دیکھیں آنکھیں ہیں وہ اس طرف
وگر منھ ہمارا ہے سو اس طرف

اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی
اُدھر ہی چلی جائے ہے جان بھی

کہو اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے
کیا عشق یا جرم ہم نے کیے

نہیں صبر آتا ترے بن ملے
لبوں سے جگر تک بھریا ہیں گلے

کسو سے کسو سے نہ ہو جائے لاگ
کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ

کسو کا کسو کو نہ لگ جائے دل
کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل

کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن
کہ جانِ الم ناک دیجے ندان

کسو کے مجعد نہ کھل جائیں بال
کہ ہو دل کے عقدوں کی واشد محال

کسو لالہ رُخ کا نہ اُٹھے نقاب
کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب

قد آرا نہ ہو فتنہ در سر کوئی
کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی

کسو کے نہ چاہِ زنخ میں گریں
مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں

کسو کے نہ انداز پر جا سے جا
صبا ہووے کیا جانیے کیا سے کیا

کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں
کہ لوگ اس کا آخر پرکھیا کریں

کسو کے نہ ایما ے ابرو پہ جائیں
فریبِ فریبندگاں تا نہ کھائیں

صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو
کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو

دلِ زار تجھ بن ہے بے کل بہت | نہ جی کو مرے بن ملے کل بہت
گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں | یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں
انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں | کوئی اُن کو ڈھونڈھے تو پھر یہ کہاں
کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار | ہمارا ترا عشق ہے یادگار
ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں | تلطّف کہ ہم میں رہا کچھ نہیں
نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے | گل تر پہ چند اُوس باقی رہے
گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں | تلف جیسے ہر دم ہو آب رواں
نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں | اٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں
نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش | کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش
نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی | کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی
نہ پڑتی مری آنکھ گر اس کی اُور | تو اٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور
ہوئی آتش عشق آخر بلند | جگر دل ہوئے دونوں اس کے سپند
زبانے تھے اس آگ کے کیا دراز | ہوئی دونوں بے تابوں کی جاں گداز
پڑی آگ وہ، دل جگر جل گئے | جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے
ہوا ناگہاں شوہرِ زن مریض | نہایت ہوئی تپ طویل و عریض
تشتت ہوا تپ کا دل کے تئیں | کھنچی رفتہ رفتہ دق و سل کے تئیں
نزاری سے دل ہوگیا زار تر | ہوا خشک ہو کر وہ بیمار تر
بدن کاہ سا رنگ کاہی ہوا | بہت حال اس کا تباہی ہوا
دموں پر بھی وہ رفتنی کم ہوا | ٹھہر کر گئے دم ہوا ہوگیا

فنا یعنی طاری ہوئی ، ہو چکا — اسے دار و دستہ بہت رو چکا
جلانے کی تیاری کرنے چلے — چلی زن بھی تا ساتھ اُس کے جلے
کھلی دعوئے سوختن میں زباں — کیا پاس ظاہر سے نقصانِ جاں
لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو — خبر پہنچی اس نو گرفتار کو
اٹھا واں سے بے تاب آیا چلا — اسے دیکھ جلتے بہت جی جلا
جھکا آگ کی اور کر اضطراب — کہ جی ہی دیا نہ طاقت تھی مطلق نہ تاب
کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی — نظر اس کی جلتے جو اس پر پڑی
کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم
یہ بے تاب تھا آگ پر پھر پڑا — پتنگا سا اس آگ پر گر پڑا
لگے آئے تھے کتنے انفار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اسے ہاتھوں ہاتھ
چلے ادھ جلا لے کے سب اس کو گھر — ہوا گرم ہنگامہ اک یہ اُدھر
کیا لوگوں نے اس کے سر پہ ہجوم — ہوئی شہر میں شورِ محشر کی دھوم
قدم کتنے چل کر وہ آتش بہ جاں — ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں
تعب کش ہوں میں آتشِ تیز کا — اسے قصد تھا میرے خوں ریز کا
لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال — کیا گھر بھی لے چلنے کا اب خیال
نہیں متصل راہ چلنے کی تاب — کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب
کہیں مجھ کو سایے میں ٹھیرائیے — جو دم ٹھیرے تو آگے لے جائیے
کوئی دم مرا کھینچیے انتظار — کہ گرمی سے ہوں اب بے خود و بے قرار
توقف کیا سب نے زیرِ درخت — کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ جانا کہ ہے مانع راہِ عشق ‌ ‌ رکھے ہے عجب جذب جاں کاہ عشق

نہ آتش، نہ گرمی، نہ بے طاقتی ‌ ‌ بہانے ہیں سب جذب ہے الفتی

عجب تر نظر آتے ہیں کارِ عشق ‌ ‌ نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرارِ عشق

اٹھانے کو کہتے تو کہلاے تھا ‌ ‌ دل اس کا اِدھر ہی چلا جاے تھا

اگر آنکھیں کھلتیں تو اُودھر نظر ‌ ‌ ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام ‌ ‌ نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں، چماں آتی ہے وہ پری ‌ ‌ وہی ناز و عشوہ، وہی دل بری

وہی صورت اُس کی ہے جلوہ نما ‌ ‌ وہی رنگ رو گل کا غیرت فزا

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ ‌ ‌ اٹھایا اسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

گئی اس طرف لے جدھر تھی جلی ‌ ‌ نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی

ولے مانعیت کا کس کو جگر ‌ ‌ کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں ‌ ‌ گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

بہت سے ہوئے لوگ گرمِ سراغ ‌ ‌ کنھوں نے نہ پایا نشاں غیر داغ

نہ کر میرؔ اب عشق کی گفتگو ‌ ‌ قلم اور کاغذ کو رکھ دے بھی تو

فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار ‌ ‌ اِسی کشت و خوں کا ہے یہ گرم کار

بہت خاک جل جل کے یاں ہو گئے ‌ ‌ رہِ عشق میں جی بہت کھو گئے

غرض ایک ہے عشق بے خوف و باک

کیے دونوں معشوق و عاشق ہلاک

---

(۵)

مُعاملاتِ عشق

تمہید

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق ہے عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق تھا جو رسول ہو آیا
اُن نے پیغامِ عشق پہنچایا

عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں
ہے محمدؐ کہیں علی ہے کہیں

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہرِ عجائب ہے

عشق کیا کیا مصیبتیں لایا
روز کو رات کر کے دکھلایا

عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں
عشق سے رنگ سبز لاتے ہیں

عشق سر تا قدم اُمید ہوا
زیرِ تیغِ ستم شہید ہوا

مجھ سے مت پوچھ یہ کہ کنھیں ہے عشق
عشق ہے انھیں کو جنھیں ہے عشق

عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے

رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر
یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر

عشق ہی کا خراب ہے کنعاں
عشق ہے ایک خانہ آباداں

عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا
اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا

قیس کیا رنج کھینچ کھینچ موا
سر پہ فرہاد کے سُنا جو ہوا

عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں
آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں

عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے
ایکوں کا جیب تا بہ دامن چاک ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک
شان ارفع ہے جن کی خوار ہیں یاں عقل والے جنون شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوے
بادشہ عشق میں فقیر ہوے

کوئی دل تنگ ہو کنوئیں میں گرا کوئی ڈوبا، کوئی گیا نہ پھرا
جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ جب دیا جی کو اُن نے پیش چراغ
عشق کی فاختہ ستم کش ہے عشق سے عندلیب دم کش ہے
عشق باعث ہوا وطن چھوٹے مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے
مایۂ درد و رنج سب ہے عشق متصل رونے کا سبب ہے عشق
پڑ گئے دل جگر میں آخر چھید کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید
اپنی تیغِ ستم جو اینچے عشق جامے بہتوں کے خوں میں کھینچے عشق
عشق سے قمری ہے حریفِ سرو مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرو
عشق کے دل فگار سارے ہیں ان نے کیا کیا جوان مارے ہیں
کہیں حق ناحق ان نے خون کیے کہیں سر پر کھڑا ہے تیغ لیے
کوئی محوِ گزاف ہیں اس سے کہیں میدان صاف ہیں اس سے
اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ ایک فرقہ کا ہے یہ جی کا روگ
ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے ایک کا دن سیاہ ہے اس سے
ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی ایک کو بے دمی ہے جیسے غشی

ایک ناشاد زندگانی سے
ایکوں کے دل گداز پانی سے
ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں
ایک کی جان ہی کے لالے ہیں
ایک نے کوہ اس سے توڑ دیے
ایک تنکا گر اُن نے توڑ دیے
چپ لگی ہے کسو کو اس کے سبب
بند رہتے نہیں کسو کے لب
کوئی باتیں کرے ہے شوق کے ساتھ
کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ
ہے تواجد کسو کو حال کہیں
کہیں نقصان ہے کمال کہیں
ایک محوِ لباسِ عُریانی
ایک سرگرم دامن افشانی
کسو کا ذکر، کوئی ذاکر ہے
کوئی صابر ہے کوئی شاکر ہے
کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات
عشق کے ہیں گے مختلف حالات
سیر قابل ہیں اس کے دیوانے
سننے کی گوں ہیں ان کے افسانے
وصل میں جن کے دل رہیں بے جا
فصل ہو تو انھوں کا حال ہو کیا
اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا
عاشقِ زار میرا نام ہوا

قصّہ میرا بھی سانحہ ہے عجب
کس پہ گزرا ہے یہ ستم، یہ غضب

معاملۂ اول

ایک صاحب سے جی لگا میرا
اُن کے عشووں نے دل ٹھگا میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت
نام سے اُن کے تھی مجھے اُلفت
خوبی ان کی جو سب کہا کرتے
گوش میرے اُدھر رہا کرتے

بختِ برگشتہ پھر جو یار ہوے | اک طرح مجھ سے وے دو چار ہوے
کیا کہوں طرز دیکھنے کی، آہ | دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ
چپکے منہ اُن کا دیکھ رہتا میں | جی میں کیا کیا، پہ کچھ نہ کہتا میں
وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے | پر تصرف میں ایک اور کے تھے
کرتے ظاہر میں احتیاط بہت | مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت
بات کی طرز میری ہی بھاتی | میری آزردگی نہ خوش آتی
پیار چتون سے پھر نکلنے لگا | دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں | بے دماغ اور بے گمان رہیں
کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے | قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم | کہنے لگتے کہ کیا گدا کی قسم
ایک دو دن میں بعد رفع ملال | لطف سے پوچھنے کہو، کچھ حال
جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا | یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا

دیکھ کر روتے، آپ بھی روتے
دل دہی کرتے جب تلک سوتے

معاملۂ دوم

ایک مدت تلک یہ صحبت تھی | کبھو الفت، کبھو یہ کلفت تھی
رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا | ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا
گاہ بے گاہ پانوں پھیلاتے | میری آنکھوں سے تلوے ملواتے

چل کر آتے تھے جب کبھو ایدھر — پاوں رکھتے تھے میری آنکھوں پر

دیکھنے میں تو پائے مالی تھی — حسن سے چال یہ نہ خالی تھی

چلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل — کہ ٹک اے سرو ہو اِدھر مائل

کفِ پا رکھیے یاں تو احساں ہے — تیرے پاوں تلے مری جاں ہے

ہنس کے سینے پہ پاوں رکھ دیتے — دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے

کیا کہوں کیسا قد بالا ہے — قالب آرزو میں ڈھالا ہے

ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب — پیکر نازک اس کے سب محبوب

موے سر ایسے جی بھی کریے نیاز — بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز

اس کے کاکل سے حرف سر نہ کرو — کاکلِ صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تم کو سودا ہے — کالے کوسوں کی بات کا کیا ہے

اس کی زلفوں میں دل گئے نہ پھرے — رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اس جبیں سے ہے دل کی کب جاذب — صبح صادق کے دعوے ہیں کاذب

ویسی بھوئیں کشیدہ بھی ہیں کہیں — یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اُور سب کی نگاہ — چشم پر میری تیری چشم سیاہ

کہوں چتون کے دیکھنے کا طور — اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطح رخسار آئینے سے صاف — جو نہ ٹھیرے نگاہ تو رکھئے معاف

لطف بینی کا فہم ہے دشوار — ایک باریک بینی ہے درکار

کیا چمکتا ہے ہاے رنگ قبول — جیسے کھڑا گلاب کا سا پھول

ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ — کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

اس سے گل کیا چنے کوئی ہم دم
غنچۂ ناشگفتہ ہے بھی کم

برگ گل سے زباں ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو

دم بہ دم سوے گوش اشارۂ صبح
گوہرِ گوش یا ستارۂ صبح

جب بنا گوش اُن نے دکھلایا
صبح کا سا سماں نظر آیا

ان لبوں کا مزا لیا سو بھانت
تسکے اوپر ہمارا بھی ہے دانت

تم نہ گل برگ و لعل ناب کہو
بات جب تک نہ ٹھیرے چپکے رہو

کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے
ہم تو مرتے ہی ان لبوں پہ رہے

کنج لب آرزوے جان و دل
آ گئے چلنا نگاہ کو مشکل

ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

جو حلاوت انھوں کی کہیے اب
ہم دگر سے جدا نہ ہوویں لب

جب وہ کھاتے ہیں بیڑۂ پاں کو
رو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو

ایسی ہوتی نہیں ہے سُرخ لبی
رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی

ہو تبسم سے لعل کا دل خوں
ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں

نہیں دیکھے مسی ملے دنداں
برق ابرِ سیہ ہے تب خنداں

کیسے کیسے چمکتی ہے بے تہہ
جگ ہنسائی کرے ہے اپنی یہ

لو اگر کیجے اس زنخ کا سیب
جاے سر سے جنوں کا آسیب

رہے گردن میں ان کی میرا ہاتھ
یہ تو یارب ہے میرے جی کے ساتھ

بس چلے تو گلے لگا ہی رہوں
تیغ سے پھر جدا کریں تو نہ ہوں

اس میں ہر چند جی کا نقصاں ہے،
مدعا اختلاط پنہاں ہے

خوش و پرکار کب پری اُن سی
اور ہو تو کہاں ہے ہم جنسی

دیکھیے از بس برآمدہ سینے
ایسا معلوم دل جو یوں چھینے

کیا نظر گاہ کی، کروں خوبی
نظریں اٹھتی نہیں، یہ محبوبی

شانہ و دست، ساعد و بازو
دل کشی میں تمام یک پہلو

اس کے پہلو سے تو میں ہو کے جدا
دردِ پہلو سے تنگ دل ہی رہا

ہائے اس سے خدا جدا نہ کرے
دور اس سے جیوں، خدا نہ کرے

یوں نہیں سرخ اس کی ہر انگشت
ڈوبی ہیں میرے خون میں یک مشت

وہ کفِ دست راحتِ جاں ہے
کاش سینے پہ رکھ دے غم یاں ہے

کیا بیاں خوبیٔ شکم کو کرے
دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے

صدر کے ناچیے سے لے تا ناف
چپ کی جاگاہ ہے کیونکہ کہیے صاف

اس سے پھر آگے غنچۂ گل ہے
یاں سخن بابتِ تامل ہے

پردے میں بھی جو کچھ کہا جاوے
آپ سے تو نہ ٹک رہا جاوے

گئیں نظروں سے وہ کمر باریک
ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک

اور کیا دل زدے کو بات آوے
کہیں یارب شتاب ہاتھ آوے

نازکی اس میاں کی کیا کہیے
بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیے

ٹک اگر لچکے تو قیامت ہے
پھر قیامت تلک ندامت ہے

کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق
اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق

پائے جاناں سے گفتگو ہے اب
خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب

وہ قدم کاش فرقِ سر پہ ہو / ساقِ سیمیں مری کمر پر ہو

وہ کفِ پا قریب ہو میرے / ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے

پنڈلی نازک ہے شاخ سنبل کی / پشتِ پا پنکھڑی سی ہے گل کی

یوں نصیبوں سے ہو حنا کا ناؤں / ورنہ ڈوبے ہے کیے خون سے پاؤ

ناخنِ پا حنائی ہیں ایسے / برگِ گل پا سے سرو ہوں جیسے

ہو خراماں تو اس طرف نگہیں / گل کفش اس کی لوگ دیکھ رہیں

گل و بلبل سبھی تماشائی / آ گئے جس طرف بہار آئی

رنگِ رفتار کو دیکھ مجنوں ہو / طرزِ گفتار جیسے افسوں ہو

سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی / ساتھ ان خوبیوں کے یہ خوبی

کہ بہت دل ہے آشنائے رحم / درد مندوں کو جانے جائے رحم

اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ / اس کو مد نظر ہے مجھ سے نباہ

طعن و تعریض بیچ میں آئے / کچھ نہ خاطر میں وے مجھے لائے

راستے میں اک طرف وفا کے لیے / چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کیے

نہیں آزار کی روا داری / مہر ورزی ہے یا وفاداری

پر جو معشوقی آب و گل میں ہے / چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے

میں گروں تو کہیں خوش آتا ہے / تیرا آزار جی سے بھاتا ہے

خواہ ناخواہ وہ نہیں منظور / کہ رہے دل شدہ مرا رنجور

یہ بھی شوخی سے ہے گہے گاہے

پر اس انداز سے کہ جی چاہے

معاملۂ سوم

ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ
باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ

پاؤں سے ایک انگلی بل ڈالی
لطف سے درد وہ نہ تھا خالی

درد سے کی جو میں نے بے تابی
دستِ نازک سے دیر تک دابی

یاد آتے ہیں ایسے لطفِ خواب
گزرے ہیں جانِ غم زدہ پہ غضب

تن بدن دیکھ جی نہ رہتا تھا
میں جو گستاخ ہو کے کہتا تھا

کہ یہ جا گہ تم اس فقیر کو دو
متبسم ہو کے کہتے وے "یہ لو

یہ بھی کیا کیا خیال رکھتے ہیں
آرزوے محال رکھتے ہیں

پھر گھڑی بھر میں کہتے، ہو نہ ملول
مار کھانے کی باتیں سب ہیں قبول

جب سلوک ان کا یاد آتا ہے
کیا کہوں جی ہی بھول جاتا ہے

معاملۂ چہارم

ایک دن پان وے چباتے تھے
سُرخ لب اُن کے مجھ کو بھاتے تھے

کہہ اُٹھا میں اگر اُگال مجھے
منہ سے دو تو کرو نہال مجھے

بولے یوں ہیں ہے میں کہا ہاں سچ
جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کے لالچ

ہنس کے اس وقت مجھ کو ٹال دیا
پھر اسی رنگ سے اُگال دیا

ایسی صد رنگ مہربانی تھی
تب سیہ رو کی زندگانی تھی

اب کے سے رنگ گر فلک لاتا
خاک کے رنگ میں مجھے پاتا

مُعاملہ پنجم

منقبت ایک مجھ سے کہوایا
جس کا میں نے صلہ انھیں پایا

پھر وہی کرتے ہیں جو کچھ کہتا
ایک پردہ سا بیچ میں رہتا

دوستی، رابطہ، وفا، اخلاص
ساتھ میرے تھا ان کو ربطِ خاص

میں تقاضائی ملنے کا رہتا
مختلط ہونے کو سدا کہتا

میری تسکیں تھی ہر زماں منظور
آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور

وصل کے وعدے بھی رہا کرتے
آج کل، رات دن کہا کرتے

دل تو تھا رحم آشنا، ازبس
کڑھتے تھے جان، کر مجھے بے کس

جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ
سینہ خستہ، خاک افتادہ

دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل
کہتے اے میرؔ کچھ نہیں حاصل

دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا
جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا

آفتِ جاں ہے دوستی کرنا
کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا

میں جو دیوانہ ان کے رو کا تھا
شیفتہ پیچ دار مو کا تھا

کچھ نہ سمجھی گئی، کہن ان کی
اب جدائی جو ہے کٹھن ان کی

یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں
وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں

معاملۂ ششم

گل رووں بن جگر ہے داغ و کباب — گیسووں بن ہے جی کو پیچ و تاب
صورت ان کی خیال میں ہر دم — خواب میں جو ہوں وہ مژہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اُداس — چاند سا منھ انھوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بے خود و بے خواب — ایک پیکر پری کا سا ہم خواب
فرش پر پاؤں یہ غبار آلود — ان میں وے دونوں پا نگار آلود
میں تو افتادہ محوِ عجز و نیاز — بازو میرے کسو کی بالشِ ناز
جلتی آنکھوں کنے گلِ رخسار — جس پہ کچھ بکھرے موے عنبر بار
پاس منھ کے وے لعلِ تر نازک — دستِ گستاخ پر کمر نازک
فرش اس گل بدن سے سب بو یا — پھول میں نے بچھائے تھے گویا
شب کٹی صورتِ خیالی سے — دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے
گرچہ روزانہ بھی تصور تھا — لیکن اندوہ سے مکدر تھا
کہیں تصویر سی نظر آئی — کہیں منھ پھیر جیسے شرمائی
کبھی دل اُن کے رو و مو میں رہے — کبھی ملنے کی آرزو میں رہے
صورتِ حال اور کچھ ہر دم — گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم
میں نے مقدور تک وفا کی ہے — جانِ غمناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں — روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا — زن و فرزند و خانماں سے گیا

کیچ پانی ہو، مینھ ہو یا برسات
روز روشن ہو یا اندھیری رات

اُن تلک میرے تئیں پہنچ رہنا
بیٹھے منھ دیکھنا نہ کچھ کہنا

آشنا یار سارے بیگانے
کہ ہوئے میرؔ جی تو دیوانے

رشتۂ ربط انھوں نے توڑ دیا
ملنا جلنا سبھوں سے چھوڑ دیا

نظر آتے نہیں ہیں مدت سے
اُنس پیدا کیا ہے وحشت سے

صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں
جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں

چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ
پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ

مل گیا جو کوئی تو نچ نکلے
بڑی خبطی دیوانے سچ نکلے

شوق سے ان کا حالِ دیگر گوں
پارہ پارہ دل و جگر سب خوں

رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور
کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور

کیا بیاں کریے بے قراری کا
ذکر کیا حالِ اضطراری کا

جی پڑا ترسے ساتھ سونے کو
دل پریشان جمع ہونے کو

پاس اُن کے رہوں تو دل کو قرار
پھر نہ ٹھیرے ٹک ایک کریے ہزار

گئی برباد عزت ان کے لیے
خلف لوگوں نے منھ پہ طعنے دیے

گھورے پر سے جو اُٹھ نہ سکتے تھے
وے بھی کناس پوچ بکتے تھے

سفر آیا جو ان کے تئیں درپیش
ساتھ اس رنج میں بھی تھا درویش

کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں
ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں

جو پڑھے گا بسنگ نامہ یاں
ہو گی ساری حقیقت اس پہ عیاں

یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام
کہ محبت سے یاں ہے حرفِ کلام

معاملۂ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط
ہو سکا نہ دو طرف سے ضبط

تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب
جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب

ایک دن ہم وے متصل بیٹھے
اپنے دل خواہ دونوں مل بیٹھے

شوق کا سب کہا قبول ہوا
یعنی مقصودِ دل حصول ہوا

واسطے جس کے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ

گہ گہے دست دی ہم آغوشی
ہم سری، ہم کناری ہم دوشی

چند روز اس طرح رہی صحبت
پیار، اخلاص، رابطہ، الفت

کچھ کہوں جو انھوں کی ہو تقصیر
نارسائی تھی طالعوں کی میر

ہو گئے بخت اپنے برگشتہ
پھر کیا آسماں نے سرگشتہ

بات ایسی ہی اتفاق پڑی
کہ ہوئی سر پہ فرقت آن کھڑی

لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ
کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ

یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش
کہ نشانِ بلا ہوں الفت کیش

میں اٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ
کڑھیو مت تو ہے میری جان کے ساتھ

اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے
کیا کروں آبرو مقدم ہے

میں کہوں کیا مجھے نہ اپنا ہوش
جیسے تصویر سامنے خاموش

آنسو آنکھوں میں پر پیے جاؤں
وے کہیں کچھ تو ہاں کیے جاؤں

ان سے رخصت ہوئے جو بعدِ شام
تیرہ دیکھا جہان کو ہر گام

دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی
جان کو رفتگی کی حالت تھی

یوں ہوا ان کے کوچے سے آنا
جیسے ہووے جہان سے جانا

اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا
چارپائی پہ ہوں تو مردہ سا

جی انھوں میں، فسردہ قالب یاں
متحرک ہو کیا تنِ بے جاں

حال دل کا کہوں جو ہم دم ہو
کروں پیغام کچھ جو محرم ہو

جی میں کچھ آیا، رو کے بیٹھ رہا
دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا

کوئی آیا جو واں سے جی آیا
سو نہ آیا کبھی، کبھی آیا

دیکھیے چند یوں رہیں گے جدا
چاہیے ہے کیا ہمارے حق میں خدا

خونِ دل کب تلک پئیں گے ہم
رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم

آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی
دل دہی، حال پرسی، محبوبی

تند ہو کر نہ بات کو کہنا
ملتفت حالِ زار پر رہنا

لطف مبذول حال پر ہر آن
تازہ ہر دم مروّت و احسان

لب سے جاں بخش، حرف سے دل جو
لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو

یاد کر روؤں ان کی کونسی بات
کس طرح کاٹوں ہجر کے اوقات

ملنا ان سے ہو پھر گھٹے غم بھی
آئے جیتوں میں جانیے ہم بھی

مدتِ ہجر اگر تمام ہوئی
ورنہ اپنی تو صبح شام ہوئی

(۶)

جوشِ عشق

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
کر ٹک دل کا رازِ نہانی
یعنی **میر** اک خستۂ غم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگاہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت
تاب و تواں و شکیب و تحمل
سینہ فگاری سامنے آئی
کرتے آئے داغ سیاہی
خونِ جگر ہو بہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا
چاکِ جگر سے محبت ٹپکی
سوز سے چھاتی تا بہ گویا
آہ سے اس کی مشکل جینا
دل میں تمنا، داغ جگر میں
نالے شب کو اس کے سُن کر
آہ و فغاں ہے اس کے لب پر

چل اے خامے بسم اللہ اب
ثبتِ جریدہ میری زبانی
سر تا پا اندوہ و الم تھا
بے خود ہو گئی جانِ آگاہ
تاب نے ڈھونڈھی یک دم فرصت
رخصت اس سے ہو گئے بالکل
بے تابی نے طاقت پائی
کام جگر کا کرنے تباہی
پلکوں ہی پر رہنے لاگا
ایک گھڑی آرام نہ پایا
آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی
اور پلک خوں تا بہ گویا
درد فقط تھا سارا سینہ
شیون لب پر، یاس نظر میں
مر گئے کتنے سر کو دُھن کر
روز نئی اک آفت سب پر

رو و جبیں پہ خراشِ ناخن — داغوں سے خوں کے قامت گل بن
زخمِ سینہ دل تک پہنچا — کوئی نہ اس گھائل تک پہنچا
آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا — فوّارہ لوہو کا چھوٹا
غم نے تو دل میں کیا ہے پھوڑا — پر میں تھا اک پکّا پھوڑا
سو نہ گیا یک دم وہ بے کل — بخت نہ جاگے اس کے اک پل
کام رہا ناکامی ہی سے — تسکیں بے آرامی ہی سے
رخساروں پر خون رواں ہو — دل میں ہو سو منھ پہ عیاں ہو
دشنۂ غم سے سینہ کوچا — ناخن سے منھ سارا نوچا
دل آماجگہِ غم ناکی — اور نفس اک تیرِ خاکی
نے طاقت نے یارا اس کو — ضعفِ دلی نے مارا اس کو
نالۂ دل میں حزینی اُس کے — خاطر میں غم گینی اُس کے
رنگ اڑے چہرے کا ہر دم — تھا گویا گل آخر موسم
دست بہ دل ہر آن رہے وہ — بے طاقت بے جان رہے وہ
رنگ شکستہ بسکہ فسردہ — کہنے کو زندہ لیکن مردہ
خوں باری سے چہرہ گل گوں — حلق بسمل دیدۂ پُر خوں
جدولِ جاری چاکِ گریباں — گوشۂ دامن وقفِ مژگاں
دیدۂ تر کے دریا قائل — ساحل خشک لبی کے سائل
ہر دم ہو ہر سمت کو جاری — خوں باری سے سیل بہاری
تشنہ لبی اک منھ پر پیدا — لب چش جس کا ہووے نہ دریا

خاک بسر آشفتہ سری سے — شورِ قیامت نوحہ گری سے
سر تا پا آشفتہ دماغی — داغ جنوں دے جس کو چراغی
غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا — جامے میں اک تار نہیں تھا
وادی پر جب اپنی آوے — صحرا صحرا خاک اڑاوے
کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو — اشک کی جاگہ ریگِ رواں ہو
گل اُن نے ازبسکہ کھائے — پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی — شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ — جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہِ سرد کرے وہ عریاں — بید سا کانپے موے پریشاں
گرد کی تہ اس کا پیراہن — دامنِ صحرا جس کا دامن
بارِ دامن تارِ گریباں — دامن قرب و جوارِ گریباں
پامالی میں مثلِ جادہ — نقش قدم سا خاک افتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی — دور کھنچی اس کی رسوائی
اُس سے جو پامال ہوے سب — خارِ بیاباں لال ہوے سب
جن نے دیکھا اس کو یک دم — ان نے کھایا بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا — پر یہ مدت تنک یاد رہے گا
جلنا اس سے کرے نہ کنارا — جیسے چراغِ وقفہ بچارا
لو ہو ٹپکے آہِ سحر سے — نالہ گتھواں لختِ جگر سے
رکھتا تھا سدا وہ دیوانا — وردِ زباں یہ شعرِ دانا

صَارَا فُؤَادِیْ شَقًّا شَقًّا حَقًّا حَقًّا حَقًّا حَقًّا

ہوش و خرد ناشاد گئے سب
دین و دل برباد گئے سب

دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ
ہر اک کا منہ دیکھ رہے وہ

حسرت اس کی ایک اعجوبا
آب دہن کی موج میں ڈوبا

غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے
بات کرے تو اشاروں ہی سے

سمجھو تو کوئی داد کو پہنچو
عاشق کی فریاد کو پہنچو

ورنہ رہے ہن مار کر اپنا
سر دے مارے ہار کر اپنا

کیونکر غم سے ہو آزادی
جان کے ساتھ اس کی ناشادی

کوئی نہ اس پر سایہ گستر
اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر

نے کعبے نہ دیر کے قابل
مذہب اس کا سیر کے قابل

کیا کہیے کیسا کچھ تھا
القصہ وہ ایسا کچھ تھا

وہ کیسا تھا جس پر عاشق
جی سے تھا یہ عاشقِ صادق

دیدۂ گل میں جاگہ اس کی
نگہتِ گل گردِ رہ اس کی

چشم بہ رہ سارا چمن اس کا
نقشِ قدم تھا یاسمن اس کا

آگے اس کے کبھو نہ خوش آیا
یہ رو گل نے کہاں سے پایا

گل آشفتہ اس کے رو کا
سنبل اک زنجیری مو کا

جب وہ چہرہ تابندہ ہو
ماہ دو ہفتہ شرمندہ ہو

زلف اس چہرے پر تابندہ
کاکل صبح سے خوش آئندہ

دیکھ اس گل کی نور فشانی
شمع مجلس پانی پانی

ہو ہر چند یہ بدرِ کامل
اس چہرے کے ہو نہ مقابل

حوصلہ کتنا اس بے تہ کا
منھ دیکھو آئینہ مہ کا

رکھتی تھی دعوائے خوش چشمی پر
لیکن اس کی چشم نظر کر

بہتوں کی جب جانیں کھل گئیں
نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں

دورِ چشم ہے اس کا جب سے
فتنہ اک سوتا نہیں تب سے

رُخ و لب سے جاں بخشِ عالم
بلکہ سراپا جانِ مجسم

عیسیٰ کو گر لب دکھلاوے
ہرگز اس کو بات نہ آوے

کوئی مرو اندازِ حیا پر
چشم اس کی تھی پشتِ پا پر

کچھ مت پوچھو تنگی دہن کی
مشکل تھی واں جائے سخن کی

کر کے شمیمِ زلف گزارا
پھیلا وے ہے عنبر سارا

خط آیا ہے گرد اس لب کے
شاید شکر تنگ ہوا ب کے

دونوں لب اس کے لعلِ بدخشاں
دستِ حنائی پنجۂ مرجاں

تھا دیکھا یک رہ پردے میں
برقِ خرمن، مہ پردے میں

جس دم بُرقع منھ سے اٹھاتا
خورشید اس دم ڈوبا جاتا

پار دلوں کے خدنگ مژہ کا
کاوش کم کم تنگ مژہ کا

بھولا کی کشش کا دوانہ عالم
تیرِ نگہ کا نشانہ عالم

تیغ و تبر تھی ابرو اس کی
آتشِ سرکش جو تھی اُس کی

ناز کی مے سے مست رہے وہ
اکثر دست بہ دست رہے وہ

زلفوں کے سب تار پریشاں — سر اوپر دستار پریشاں

سایے سے اس کے سرو بنایا — خاک راہ سے تدرو بنایا

ہووے خراماں جب وہ کافر — کبک کی ہووے جان مسافر

چشم کرشمۂ جانِ تغافل — شایان اس کے شان تغافل

کیا جانے وہ حال کسو کا — پتھر دل اُس آئینہ رو کا

پاتے رہی ابرو کا اشارا — غمزے نے اک خنجر مارا

جب وہ خرامِ ناز کرے ہے — جی کو حورِ نیاز کرے ہے

رخصت دے گر عشوہ گری کو — ایک ہی جلوہ بس ہے پری کو

ہنسنے میں وہ صفائے دنداں — برقِ خرمنِ عالمِ امکاں

رشک سحر کو صافی تن پر — خونِ صراحی اس گردن پر

آہ صفائی اس سینے کی — غیرت افزا آئینے کی

شکل چیں میں ناز کہاں ہے — صورت ہے انداز کہاں ہے

ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے — رحم ہے اس پر اب جو نہیں ہے

جب وہ شکل نظر آتی تھی — کلفت دل کی نکل جاتی تھی

رنگیں اس کی اس کفِ پا سے — جائیں نہ کیوں یاں اپنی جا سے

چشم کرد انصاف کی گروا — یوسف و شیریں، لیلیٰ، عذرا

کون ہوا اس محبوبی سے — خوبی تو تھی پر اس خوبی سے

بار نزاکت کیوں کر اٹھاوے — شاخِ گل سا لچکا جاوے

ہے گی رگِ گل یا رگِ جاں ہے — پر نازک اسرار میاں ہے

صید ملک قربانی اس کا　　یوسف اک زندانی اس کا
اور جو خوباں پاویں اس کو　　یک دیگر دکھلاویں اس کو
جاوے اس پر جان سبھوں کی　　تیغ رہے درمیان سبھوں کی
تھانبا جاوے کس کے کنے وہ　　غصے ہو تو پھر نہ منے وہ
کیا کوئی شوخی اس کی بتاوے　　کچھ ٹھیرے تو کہنے میں آوے
کیا ہے اُس کے آب و گل میں　　آرزو اس کی سب کے دل میں
سب کو میل اس بت کی ادا کا　　بندہ کون رہا ہے خدا کا
دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے　　پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے
عاشق ظلم و جور و جفا کا　　دشمنِ جانی اہلِ وفا کا
کوچہ رشک فزائے کعبہ　　واں پہنچے نہ دعائے کعبہ
ہر شب اک فریاد و تظلم　　اٹھ گئی واں سے رسم ترحم

آہیں جن کی وردِ وظائف
ہو دل خستے واں کے طائف

کر اے خامہ وہ تحریر اب　　آوے زباں پر جو تقریر اب
یعنی میر اس خستۂ غم کا　　سرتا پہ اندوہ و الم کا
یارِ سفر کا مائل ہو کر　　حُبِّ وطن کو بھی سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا　　جلنے کے تئیں اور جلایا
وقت وداع قیامت گزرا　　سر سے آب حسرت گزرا
اک دم بے خود ہو کے رہا وہ　　اس سے آگے آپ گیا وہ

آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے
دیکھ کر اس گل کو لگا یہ کہنے
ظلم ہے لوہو پیتے رہیے
جان گئے پر جیتے رہیے
عمرِ عزیز چلی یوں جاوے
اور فلک آنکھوں سے دکھاوے
آخر کر کے خدا کے حوالا
آئینے پر پانی ڈالا
تا کہ رو دکھلاوے شتابی
راہِ دور سے آوے شتابی

یار گئے پر میرؔ جو اب ہے
جان سے خالی اک قالب ہے

راقمِ غم ہے وہ دل تفتہ
نامہ بر اس کا رنگِ رفتہ
غم سے فرصت اس کو کہاں ہے
قاصدِ اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے
تر ہو بالِ کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے
جس سے کباب کبوتر ہووے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہے
شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر
شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خونِ جگر سے انشا
یار کا اپنے شوقِ کفِ پا
ہو انگشتِ بریدہ خامہ
اور حنائی کاغذِ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ
دیکھے راہِ عمر گزشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ
آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے
ہر دم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے
مرنے قریب ہے وہ دوری سے

جب وہ دردِ دل کو جتاوے
باتوں پر اس کی رونا آوے

دستہ دستہ داغِ بسر ہے
پرکالہ پرکالہ جگر ہے

اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا
ہے یہ گرہ اک دل کی تمنا

داغِ دروں ہے گلشن گلشن
گل یہ چنے وہ دامن دامن

چھوڑے نہ راہ و رسمِ وفا کو
دے پیغام ہمیشہ صبا کو

پاس اس کے ہو گر تیرا جانا
بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا

زیرِ لب اس کے بات یہی ہے
شام سحر دن رات یہی ہے

کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم
پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم

بس اے خامہ رکھ لے زباں کو
تاب نہیں ہے اہلِ جہاں کو

قصۂ غم کو نہایت کب ہے
اس سے خموشی اب انسب ہے

(۷)

خواب و خیال

خوشا حال اُس کا جو معدوم ہے — کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جانِ غم ناک کو کاہشیں — گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے منتقل — پراگندہ روزی، پراگندہ دل

گئی کب پریشانیٔ روزگار — رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی — نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی

اُٹھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق — کہ دشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ — دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے — مری بے کسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی — غریبی نے اک عمر کی ہم سری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا — غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر — کہ نہ زادِ راہ کچھ، نہ یارِ سفر

دل اک یار سو بے قرارِ بتاں — غبارِ سرِ راہ گزارِ بتاں

گرفتارِ رنج و مصیبت رہا — غریبِ دیارِ محبّت رہا

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشمِ حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دلِ مضطرب اشکِ حسرت ہوا — جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھنچا ساری رہ دامنِ چاک دل / رہا بر قفا روے غم ناک دل

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت / بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جورِ گردوں سے خوں ہو گیا / مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام / لگی رہنے وحشت مجھے صبح شام

کبھو کف بہ لب مست رہنے لگا / کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرقِ بحرِ تحیّر رہوں / کبھو سر بہ جیبِ تفکر رہوں

یہ وہمِ غلط کاریاں تک کھنچا / کہ کارِ جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑی / تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہِ چاردہ کار آتش کرے / ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقش درست / لگی ہونے وسواس سے جان سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں / کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں / ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اس طرف / بحدے کہ آجائے ہونٹوں پہ کف

رہی فکرِ جاں میرے احباب کو / اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو

ہوے پاس کوئی تفاوت سے ہو / سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی فرطِ اندوہ سے گریہ ناک / گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے / نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کہے چشم بندی کو ہر بار غیر / ولے منزلِ دل میں اس مہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا / تصوّر مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں و لے بے خبر — وہ صورت رہے میرے پیش نظر
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگاہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
نگاہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز — مژہ آفتِ روزگار دراز
عجب رنگ پر تھا طرح رخسار کا — مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا
جو آنکھ اُس کی بینی سے جا کر لڑی — دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑی
مکاں کُنجِ لب خواہشِ جان کا — تبسم سبب کاہشِ جان کا
دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ — سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ
سزا ہے جگر اس کمو کے لیے — جو سیبِ ذقن اس کا بو کر جیے
گلِ تازہ شرمندہ اُس رو سے ہو — خجل مشکِ ناب اس کے گیسو سے ہو
سراپے میں جس جا نظر کیجیے — وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے — کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
کہیں نقشِ دیوار دیکھا اُسے — کہیں گرمِ رفتار دیکھا اُسے
کہیں دل بری اس کو درپیش ہے — کہیں مائلِ خوبیٔ خویش ہے
کہیں جملہ تن مہرِ صرفِ سلوک — کہیں مجھ سے سرگرم حرفِ سلوک
لطافت سے یک جان ہو وے تمیز — سبک سیر مانند عمرِ عزیز
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز — کہیں ایستادہ بصد رنگِ ناز
ہر یک جائے لے ناز سے وہ سبق — در و بام تصویر کا سا ورق
رہے سامنے اک طرح پر کبھو — رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو
بغل میں کبھو آرمیدہ رہے — کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے

کبھو صورتِ دل کش اپنی دکھاوے — کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپاوے
کبھو گرمِ کینہ کبھو مہرباں — کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جاں
کبھو یک بیک یار ہو جاوے وہ — کبھو دست بردار ہو جاوے وہ
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو — طرح دشمنی کی نکالے کبھو
کبھو چینِ ابرو کبھو ہنس کے بات — کبھو بے وفائی کبھو التفات
جو میں ہاتھ ڈالوں تو واں کچھ نہیں — بجز شکلِ وہمی عیاں کچھ نہیں
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی — اسی شکلِ وہمی سے صحبت رہی
دمِ صبح ہو گرمِ رہ سوے ماہ — کہ در پیش آوے یہ روزِ سیاہ
کہ جوما کروں بیدِ مجنوں کی طرز — رہے یاد اس سروِ موزوں کی طرز
رہوں زرد میں گاہ بیمار سا — پریشاں سخن گہ پری دار سا
پری خواں کو لا کوئی افسوں پڑھاوے — کسو سے کوئی جا کے تعویذ لاوے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلافِ مزاج — کھچا اس خرابی کو کارِ علاج
کہ سر رشتہ تدبیر کا گم ہوا — دل اوپر ہجومِ توہّم ہوا
دروں خود بہ خود بے حواسی رہی — پریشاں دلی اور اُداسی رہی
کروں بے کلی جاوں تا ہر کہیں — نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں
قیامت جنوں کا رہے سر میں شور — کھنچا جاوے دل کوہ و صحرا کی اور
رہے شوق سر در گریبانِ دل — ہوا کھینچے صحرا کو دامانِ دل
سرِ آشفتہ زلفِ گردگیر کا — قدم حلقہ در گوشِ زنجیر کا

جنوں آہ در پے ہوا جان کے
مجوّزِ ہوئے یار زندان کے

کیا بند اک کوٹھری میں مجھے
کہ آتش جنوں کی نگرواں بجھے

لبِ نان اک بار دینے لگے
دمِ آب دشوار دینے لگے

کہاں علم کا کسب، فرصت نہ آہ
ہوا کا بھی واں گشتِ روزن کی راہ

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے
کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے

وہ آشفتہ سر ہوش مندی سے دور
نہیں رابطہ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
در اس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز
افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز

کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی
مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی

اگرچند کہنے کو خوں کم کیا
لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بے ہوش وہ رات ساری رہا

جگایا سحر مجھ کو اک شور سے
کھلی آنکھ میری بڑے زور سے

وہی دستِ فصّاد میں نیشتر
وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر

وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھیر
وہی تر لہو میں مرا جامہ پھیر

لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں
چبھے جیسے مژگاں کسو کے تئیں

ہوا خون سے دامن و جیب تر
رگِ جاں تلک زخم پہنچا مگر

ٹپکتا رہا دیر تک خونِ ناب
مجھے لے گئی بے خودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا
پلک کا اٹھانا بھی اک بار تھا

کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا — خمار ایک مدت تلک بھر رہا
کھڑا ہوں اگر پاؤں لغزاں رہے — بدن بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے — نسیمِ سحر کار صر صر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی — افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر — کیا طاقتِ رفتہ نے منہ اِدھر
کسے تھا مِری زندگانی کا دھیان — ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت دور سے — کہ نزدیک تھا عالمِ گور سے
غلط کاریِ وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کہ تھا وہمِ دیوانگی — لگی کرنے در پردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منہ لگانے لگی
نہ دیکھے مِری اُور اس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں ٹک تسلّی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خوں — کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستوں
کہیں دل کو اپنے دکھادے مجھے — مِری بے وفائی جتادے مجھے
کہیں دست بر دل وہ رشکِ قمر — کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں بے دماغانہ سرگرمِ ناز — کہیں آتشِ شوق سے جاں گداز
کہیں چشمِ گریاں سے دامانِ پاک — کہیں سو جگہ سے گریبان چاک

کہیں کام دل کی شکایت سے ہے — کہیں نقش دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں — کہ ٹپکا کرے جس سے آزار جاں
کہیں وہ نگاہ جس سے یہ پاییے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مرجاییے
کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب — کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب
کہیں حرف زن اس طرح ناز سے — کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو — کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے — کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے — کہے تو کہ بے زار ہے جان سے
کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے — کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے — کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے
کبھو بے ادائی و دشنام ہے — کبھو باو کے ہاتھ پیغام ہے
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر — محبت کے بھی منہ سے کچھ شرم کر
کبھو وہ تبخت کہ پروا نہیں — کبھو کیونکے کہیے کہ سودا نہیں
کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد — کہ اے بے وفا حرف من یاد باد
کہ ظاہر میں میر اب تو آنا گیا — کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا
غرض نا امیدانہ کر اک نگاہ — وہ نقشِ تو ہم گیا سوے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح — نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کبھی وہم سا عالمِ خواب میں

دلِ خو پذیرِ وصالِ دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خوابِ فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
زخود رفتگی کی ادا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگِ خوابِ دل ہے کفِ شوق میں

جو بیٹھا ہوں خوابِ گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اُس کا آوے کہ سُن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یوں نہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا
ہم آغوش طالع بہت سو چکا

نہ دیکھا کبھو **میر** پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

(۸)

صیدنامۂ اوّل

چلا آصف الدولہ بہرِ شکار
نہادِ بیاباں سے اٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگے کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

طیور آشیانوں سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

سُن آوازِ شیرانِ نر ڈر گئے
پلنگ و نمر خوف سے مر گئے

جہاں ببر آیا نظر، صید تھا
بیاباں اُسے پہن سے قید تھا

گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ
دیے پنجۂ شیر نلیوں سے توڑ

نہ دیکھا نہ ہم نے سُنا یہ شکار
کہ بکری سا ہاتھی کو لیتے ہیں مار

پلنگانِ صحرا کے دل خوں ہوئے
نہنگانِ دریا ہوئے مرجیے

کہاں سہل مارے گئے نرہ شیر
لگے بکریوں کو پکڑتے بھی دیر

ہوئے لشکری جب کہ سرگرمِ گشت
مقید ہوئے مست فیلانِ دشت

گئے جانور دشت خالی رہے
بیاباں جھاڑے گئے تو کہے

عجب تر ہے یہ صید کرنے کا ڈھنگ
کہ چو رنگ ہاتھی ہوئے بے دِرنگ

نہ چیتل، نہ پاڑھا، نہ ارنا، نہ شیر
ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر

درندوں کا پیدا نہ نام و نشاں
نہ شیرِ ژیاں و نہ پیلِ دماں

کبھو فیلِ دشتی نہ جکڑے گئے
نہ یوں بھیڑ بکری سے پکڑے گئے

سنا جس طرف فیلِ دشتی کا میل
رواں فوج ادھر کو ہوئی سیل سیل

اگر ٹک بھی اٹکا تو مارا گیا
پڑے سیکڑوں پھاند چارا گیا

وگر سرکشی سے کی اِستادگی
تو پیش آئی اک طرفہ اُفتادگی

پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا
بہ زورِ آمد و شد کا حائل ہوا

جٹے دونوں وے دیو میدان میں
اٹھا شورِ محشر بیابان میں

جہاں دونوں فیلوں کی تھی سرزنی
شتر مرغ سے واں نہ ہو پر زنی

جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا
کئی روز رسّوں سے جکڑا رہا

رہے کس طرح پھٹ گیا تھا جگر
موا دوپہر میں لہو موت کر

مگر سرکشی سے نہ اپنی ہٹا
نہ میدان میں ٹک دبا ٹک گھٹا

اشارہ ہوا اس کے چو رنگ کا
سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا

برسنے لگا مینھ تیروں کا زور
ہوا فیلِ باراں کا جنگل میں شور

لگی پڑنے بجلی سی تیغِ سیاہ
پریشاں ہوا جیسے ابرِ سیاہ

نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت
گرا یوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت

رکھا لا کے لشکر میں اثنائے راہ
سر اس کا کٹا جیسے بُرجِ سیاہ

رہے کہتے اس دن عجب سب ہے یہ
سرِ فیل ہے یا سرِ شب ہے یہ

اگر دیو ہیں سرگرانی کے ساتھ
نہ اس تیرگی و کلانی کے ساتھ

دماں خشمگیں جیسے آتش یہ تھا
مگر فیلِ سر دیو سرکش یہ تھا

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح
گئے شیر مارے سو کتّوں کی طرح

گیا دشت در دشت شور شکار
ہوے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن جھکنتیوں میں رہے گھونٹتے
کھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گور و شیر ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواس جاں

گئے بیشتر چھوڑ نخچیر گاہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

اس اوقات سے جو کہ بے ہوش تھے
بہیر و بنہ کے وے خرگوش تھے

اگر ریچھ نکلا سو تھا سو بہ سو
بہت مضطرب تھا وہ آشفتہ خو

قلندر سپاہی پے جاں ہوے
لیے اس کو سر در گریباں ہوے

علف آب گوں تیغ کا پھر ہوا
کہیں پاوں اس کے کہیں سر ہوا

موے اس طرح حضرت یو حمید
کہ جوں ہوتے ہیں گے بڑے سے پلید

گرے پشت سوے فلک خاک پر
اک انبوہ تھا جسم ناپاک پر

گئے لادنے فیل پر لشکری
یہی ذات تھی لایق برتری

کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں
کہ فیلوں پہ تھے تودہ تودہ رواں

پڑے سیکڑوں دام تالاب میں
نہ چھوٹی تنک خاک اُس آب میں

نہ تیتر نہ طاوس صحرا کے بیچ
نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ

رہا گوشت ہی پکتا ہر صبح شام
جواں کھا گئے مرغ و ماہی تمام

ہوا حائل راہ بحر عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

قریب آ کے اُتری یہ خائف تھی فوج
کہ بے ڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج

مہیب اور آلودۂ خاک آب
بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب

غضب لجہ خیزی بلا جوشش پر
تلاطم قیامت لیے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے
مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے

تردد میں ہر اک کے ہوں کیونکہ پار
کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار

رواں آب ایسی روانی کے ساتھ
کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

لگے پاوں چلنے جہاں شور تھا
کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا

تامل سے اقبالِ نواب دیکھ
توقف کیا پہلے تو آب دیکھ

پھر اس پار جا کر اشارہ کیا
کہ لشکر نے وہیں گزارا کیا

شتاب اترنے لگے لشکری
نہ جوش آب کا وہ، نہ ویسی تری

وہ سوتا، جگاتا تھا جس کا خطر
اُٹھا شور سے فوج کے چونک کر

نشہ اس کے سر سے اُتر سا گیا
چڑھائی سے لشکر کے ڈر سا گیا

کچھ اک ناویں لے کچھ شجر کاٹ کر
شتابی سے دریا کے تئیں پاٹ کر

اُترنے لگا لشکرِ بے کراں
کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں

سلامت ہوا پار سب اژدہام
رہے دنگ خضرِ علیہ السلام

شکار اس کنارے بھی تھا بیشتر
ہوے صید یاں کے جگر ریش تر

گئے ارنے مارے سو مانند فیل
ہوا خون جنگل میں ان کا سبیل

رہے گور رانوں کہیں جاگتے
گئے بہر کوسوں تلک بھاگتے

پکڑ لائے چیتے گوزن اور گور
عصا سے چلے راہ یاں مار و مور

بہت ہم نے دیکھے وزیر و شہاں
شکار ایسے دستور سے تھا کہاں

نمک خوار مجھ سے تو ہیں گے ہزار
پہ میرا بھی ہونا ہے یاں یادگار

غرض میر تا دورِ چرخِ بلند
رہے آصف الدولہ اقبال مند

کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام
شکار اُس کے دشمن رہے صبح شام

غزل میر کوئی کہا چاہیے
ٹک اس بھی زمیں پر رہا چاہیے

غزل

ہم وحشیوں پہ کچھ ہو کا ہے کو یار ہے تو
اے ترک صید پیشہ کس کا شکار ہے تو

پہنچی قریب شاید نخچیر گاہ اس کی
چل صید خوں گرفتہ دل بے قرار ہے تو

دل تجھ تلک رسائی مشکل ہے چشم تر سے
عسر العبور کیسے دریا کے پار ہے تو

شہری ہیں اس کی آنکھیں کیا تجھ کو ان سے نسبت
اے آہوے بیاباں اچھا گنوار ہے تو

کیا صبح جلوہ گر ہو خوبی کے آگے تیرے
اے گل دم تبسم باغ و بہار ہے تو

یاں دو قدم بھی چلنا بن سر دیے نہ ہووے
اے راہ عشق کتنی مشکل گزار ہے تو

لیتا ہے تجھ سے عبرت جو کوئی دیکھتا ہے
کیا میر اس گلی میں بے اعتبار ہے تو

(۹)

صیدنامۂ دوم

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار
اسد باو کے گھوڑے پر ہو سوار

روانہ ہوئی فوج دریا مثال
نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال

گیا شور تا آسمانِ بریں
ہوئی گرد افواجِ گردوں قریں

زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر
فلک کو لگے دیکھنے شیرِ نر

چڑھا بسکہ دریائے فوجِ گراں
اُتر ہاتھیوں کی گئی مستیاں

دبی چپ لگا چلنے بھیڑوں کی چال
پریشاں ہے گرگِ بغل زن کا حال

پلنگوں نے کہسار سے راہ لی
نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی

بچیرے جو تھے دام میں چھا گئے
کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے

درندے پرندے چرندے چھپے
گزندوں کے منھ گرد نیچے ڈھپے

تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں
گوزن اور گور اور آہو کہاں

رہے گورِ یک شاخ و یک سو غزال
تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال

شغال اور روباہ و خرگوش سے
نہیں بحث کچھ یہ ہیں بے ہوش سے

کوئی شور سن سن کے گھبرا رہے ہے
کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے

کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ
کوئی چاہے ہے پھاند جاوں پہاڑ

کہ شاید یہ ادھر نہ ہو کل مکل
کوئی دن جیے اس بلا سے نکل

پھرے مضطرب ہو کے شیرِ عریں
کہ بیشوں میں تھے یا کماں یا کمیں

نکلتا ہے گفتار، پر بے حواس
ہزبر جگر خوار سب ہیں اُداس

کیا کام ڈرتے، گئے پھٹ جگر
بن آئی ہی مر مر رہیں ہیں نمر

اگر خرس تھا مفترد بدمعاش
لگا موش خانے کی کرنے تلاش

وگر ببر ہے پیش و پس ہے نگاہ
نہیں سُوجھتی بے حواسی سے راہ

مبادا شکاری سگانِ رکاب
گریں آکے مجھ تک بھی پہنچیں شتاب

ہوا آب زہرہ، وہ شیری گئی
جگر ڈر سے ہے خوں، دلیری گئی

ہوئی صید بندی کی جنگل میں دھوم
گرے فیل جیسے گھٹا آوے جھوم

بیاباں میں چھایا ہے کیا ابرِ مرگ
برستی ہے گولی بسانِ تگرگ

لڑائی نہیں، ہوں جو مصروفِ جنگ
اڑیں رنجکیں، اڑتے دشمن کے رنگ

جو آتا ہے پلٹن کو کچھ ولولہ
چلے ہے کوئی توپ، ہے زلزلہ

اگر جائے تھی اس کی کوہِ گراں
گیا شیر بھنکے بھی جاگہ سے یاں

نہ دل مرد ہے بر و گرمِ شتاب
دلِ شیر برفی بھی ڈر سے ہے آب

یہ رنجک کے اُڑنے کا اچھا ہے طور
ہوا آن ہی میں زمانہ کچھ اور

ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا
رکھا آب میں جا کے لک لک نے پا

محیط آب گیروں کے تھے مردِ کار
موے مالک الحزن چندیں ہزار

بہت دام پانی کی جانب جھکے
کھڑے رہ گئے، رود کیا کیا رُکے

ٹھٹک سوس گھڑیال رہ رہ گئے
مگر مچھ نہ جانے کدھر بہ گئے

نہ قشقل، نہ سلی، نہ سرخاب ہے
تمام ان کے لوہو سے سرخ آب ہے

عجب روغنِ قاز ملتے تھے یار
کہ قازوں کو لیتے ہوا میں سے مار

منگاتے تھے بلبخ کی چربی ظریف
سو وہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف

ہوے کتنے اقسامِ ماہی شکار
نہ آوے قسم کھاے بن اعتبار

مگر مرگِ ماہی تھی جالوں کے بیچ
کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اُلیچ

نہ ارنب ہے جنگل میں نے سوسمار
کوئی بدوی کیا کھاوے پروردگار

کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف
ہوے بیچ میں قرقرے بھی تلف

یہ جیسے گئے سبزہ کھا کھا کے چیت
بڑے ویسے ہی آے کھیتوں میں کھیت

بٹیر اور تیتر کا ہے کیا شمار
کہ باز آگئے جرّے کرتے شکار

ہوا زرد سبزک بہت دل میں ڈر
نمد مو ہوا گرد سے شانہ سر

خطرناک تھا دشت کیا کہیے مور
دبا یوں پھرے جیسے دبتا ہے چور

نہ پاڑھا، نہ نیلا، نہ چیتل کوئی
بنوں میں جو دوں تھی گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پر ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

غزل

کیا کشتنی ہوں میں ان نوں میلانِ یار ہے
ہر جاے پوچھتا ہے کہتے یاں کچھ شکار ہے

جاتا ہے اس کشندے کی جانب چلا ہوا
صیدِ اجل رسیدہ ہے، دل بے قرار ہے

آنکھیں جو میری باز ہیں جوں صیدِ بسملی
اُس ترک صید بند کا یہ انتظار ہے

عزت جو اس گلی میں ہے اپنی نہ پوچھیے
جب جائیے تو خشم ہے گالی ہے مار ہے

جائیں چلی گئیں ہیں بہت قلب گاہ سے
تو رہ کے جا کہ راہ ابھی پُرغبار ہے

ہے زلف و روئے یار سے ہر لحظہ بحث یاں
یہ وجہ ہے کہ شعر مرا پیچ دار ہے

کم اختلاطی کا ہے گلہ یار سے عبث
کس کشتۂ وفا سے بہت اس کو پیار ہے

گل گل شگفتگی ہے ترے چہرے سے عیاں
کچھ آج میری جان قیامت بہار ہے

کیا میرؔ تم کو گریۂ شب سے ہے گفتگو
طوفان میرے پلکوں کا سر در کنار ہے

نشیب و فرازِ بیاباں کو سُن
جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن

چڑھو آسماں پر جو آوے چڑھاو
پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاو

جو اس میں کہیں ہو وے لغزش تو خیر
کہ درپیش ہے اور عالم کی سیر

زمیں ضیق از بس ہوئی یک بیک
نہ پھیلا سکا پاؤں گز پا تنک

ملے پر سے پر تھے ہوا پر کلنگ
کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ

قیامت تھی آفت تھی ہر ایک چوٹ
لگے جس کے بھر تھا وہیں لوٹ پوٹ

ہوئے خون اُس جمع کے بے درنگ
ہوا کا ہوا اور اک دم میں رنگ

نہ پر تھا نہ پُرزا نہ بازو نہ پا
کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا

نہ زردی کو دیکھا نہ پایا کبود
نکالا ہے لوگوں نے پانی سے دود

سیہ کی بلا ترک تازی رہی
نہ سارس کی وہ سرفرازی رہی

کماں دار مردم سے چارا گیا
کسو کھیت پر مفت مارا گیا

نہ جو فیل دشتی کی مستی گئی
وہیں مٹ گیا اس کی ہستی گئی

سنانوں کی نوکوں پہ پھر بٹ گیا
وہ کوہِ گراں سنگ سب چھٹ گیا

بہت جانور چھوڑ آکھر گئے
لگی دوں بہت جل گئے، مر گئے

اگر بن ہے گویا نبا ہے اُسے
کرے قصد واں کا تو کیوں کر گھسے

مگر زور سے کچھ نکلتا ہے کام
بہت رنج کھینچے سے چلتا ہے کام

خریدارِ دستار ہر خار بن
زمیں پر رکھو پاؤں کانٹوں کو چن

کئی گام یوں راہ چلنا پڑے
پھر اس دام گہ سے نکلنا پڑے

تو آگے بیابان پرخار ہے
کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے

اگر اس میں پانی نظر پڑ گیا
کنارے پہ اس کے یہ چڑھ کر گیا

ہوا حال اپنا پریشاں بہت
پھرے مضطرب اور حیراں بہت

ترائی جو واں سے گزرنا ہوا
کہاروں کے سر چڑھ اترنا ہوا

بیابانِ وحشت اثر، پُرخطر
یہی ڈر ہے ڈر کیا اِدھر کیا اُدھر

جہاں تک نظر جاوے سوکھی ہے کانس
اگر سبزہ تھا بھی تو تھوہر کا بانس

کہیں دل رکے بند ہو جائے دم
لکھوں کیا نیستاں ہی تھے یک قلم

چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں
پڑے رات تو پھر کرے بھائیں بھائیں

نہ سبزہ، نہ کھیتی، نہ آبِ رواں
کوئی شیرِ غراں کہ پیلِ دماں

سو وہ شیر مارا گیا مثلِ سگ
وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تازہ و تگ

کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار
ہوا دل کش و جرگہ جرگہ شکار

اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب
تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بے شک و ریب

مسطح زمیں میل در میل تھی
نہ دریا چہ تھا، کوئی نے جھیل تھی

اگر آگیا رودِ خانہ کہیں — نہ دل خواہ تھا واں سے جانا کہیں
بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں — نہ تھی دہشتِ رزجیف اس دشت میں
ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ — اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں — کہ صد چشمہ تھا اس سے پانی رواں
شجر سبزہ پتھر بہت صاف تھے — سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند — ہوا پر بچھے اس کی بزدی پرند
پہر دن سے بارش لگی ہونے زور — رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوے خیمے پانی کے اوپر حباب — سب اسباب لوگوں کا تھا زیرِ آب
نہ پوچھ اور اسبابِ مردم کا حال — نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قنات اور تنبو بسر سب گئے — کھڑے تھے جو کندلے اتر سب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا — اگر فرشِ بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار — کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار
پھرے باو سے لوگ منہ ڈھانپتے — جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کید صفر شکار — ہوے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پیر جب جی کو تجنے لگے — جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہِ میغ خورشید پنہاں ہوا — نہ دیکھا مگر روے جاناں ہوا
بہت اسپ اشتر موے پاؤں بیٹ — نکالا انھیں خیمہ گاہ سے گھسیٹ

غزل پھیر یاں کوئی موزوں کرو
تامل کرو دل جگر خوں کرو

غزل

وہ دل شکار آن جو نکلا شکار کو
انداز یک نگاہ سے مارا ہزار کو

چلنا پڑے ہے رکھ کے قدم تیغِ تیز پر
کس ڈھب سے کاٹیں اس رہِ مشکل گزار کو

اڑنے لگے ہے باد میں تو جاں گزا ہے پھر
خجلت ہی اس کی زلف سے ہے تیر مار کو

سو بار منہ چڑھاتے ہو کچھ بولتے نہیں
یہ بات کیا چڑھو ہو کہے اپنے یار کو

آتا نہیں نظر کہ حصولِ امید ہو
کیا تھام تھام رکھیے دلِ بے قرار کو

جیتے رہے تو اس سے ہم آغوش ہوں گے ہم
لبریز گل سے دیکھیں گے جیب و کنار کو

کیا سمجھے خوبی میری خراشِ جبیں کی تو
اس کام کو دکھا کسو استاد کار کو

ایسے ستم کیے کہ گیا جی سے میں نداں
ٹک منصفی سے دیکھو پھر انصافِ یار کو

بولا کہ مجھ کو کرتی ہے بدنام گورِ میر
ہے خوب اگر مٹا دے کوئی اس مزار کو

کسو بن میں ارنوں کا پاکر نشاں
لگی جانے ہر صبح فوجِ گراں

مقابل ہوا آکے جوں فیلِ مست
اگر فیل تھا تو ہوا آکے پست

غضب ہے خدا کا کوئی اس کی چوٹ
اگر اسپ و اشتر ہے تو لوٹ پوٹ

نہ خوک اس کی جنگل میں گھیرے ہے راہ
نہ شیر اس کی جانب کرے سہے نگاہ

بڑی دیر جنگل میں دوڑا پھرا
لیا زیرِ بندوق آخر گرا

لگی بہنے شمشیر جدول شعار
گئے قیمہ کرنے جوانانِ کار

بہت ایسے مارے بہت کٹ گئے
نظر کرکے ہیئت جگر پھٹ گئے

کسو بن میں رونق نہ باقی گئی
جگر واں کے شیروں کے پھٹ پھٹ گئے
نہ فیلوں میں سدھ بدھ نہ شیروں میں زور
نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ
پرندہ جہاں پر نہ سکتا تھا مار
نکل شیر جنگل سے حیراں ہوئے
جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار مور
شغال اور خرگوش ہم رو یہاں
ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں
بہت جانور کھا گئے کر کباب
جو اصل تھا کیا جو کہوں تھا کہیں
بہت مضطرب جھکنتیوں میں پھرے
انھوں ہی میں سیمرغ بھی تھا مگر
نہیں فیل مرغ اور شتر مرغ اب
کسو بن میں تھے نیستاں اور کانس
برس مینھ دو دن میں کھل بھی گیا
کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود
بلا دھوم سے کوئی گھبرا پڑے
ہوا سرد ہو کر گئی جان مار

پھر اس پر جو ایسی ادائی گئی
بیابان سے کرگدن ہٹ گئے
نہ چیتوں کو جاگہ نہ گوروں کو گور
پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اکھاڑ
ہوا رہکلے توپ کا واں گزار
اڑا ہے جو تھے صاف میداں ہوئے
چلے پہروں واں تیر بندوق زور
شکاری سگوں نے کیے نوش جاں
گرے سیکڑوں ایک آواز میں
ہوئے آشیانے ہزاروں خراب
کہ تعداد کشتوں کی پاتے نہیں
سلامت نہ آخر گئے پر سرے
کہ پر مارتا ہی نہیں کوہ پر
کہ بازوں کے طعموں میں کام آے سب
چلے راہ واں لے نہ سکتے تھے سانس
ولیکن ہے کہرا لطیفہ نیا
ہوئے ہونٹ سردی سے سب کے کبود
جنھیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے
اٹھایا بڑا لطف سیر و شکار

دل اس دود تیرہ سے گھبرا گیا
کہیں آگ دیکھی تو جی آگیا

یہی چال تھی ایک دو چار کوس
ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اوس

کسو کوہ کے پاس نکلی جو راہ
گئی کوہ کی تیغ تک کم نگاہ

بلندی تھی اس کوہ کی تا فلک
نگاہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک

نہ اس رنگ سے صیاہوں گئے کہیں
ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں

جہاں دام اور دد کی تھی بود و باش
لگے چوک، لوگوں نے کی واں معاش

ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر

تراکم قیامت تھا اشجار کا
ستم پھر ہوا ہے ستمگار کا

کہ اس مرتبہ بار دو سرد تھی
ہوئے گرم تن گر کہ برف پرورد تھی

کوئی خاربن حائلِ راہ ہوا
پھٹے پیرہن، ہوش سب تہ ہوا

درختانِ بے برگ و بر بدنما
نہ اک شاخ پر مرغ رنگیں نوا

بہت سر ملائے باہم تھے شجر
ولیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر

نہ قمری ہوئی نالہ پرواز ٹک
نہ بلبل کی واں آئی آواز ٹک

یہی کل مکل تھی، یہی کشمکش
پھرے مارتے سر کو دیوانہ وش

درختوں کے انبوہ سے رک گئے
چلے اتنے جھک کے کہ ہم جھک گئے

اگر شاخ جاگہ سے اپنی ہلے
تو کانٹے سے ہم رہ رواں پر چلے

جو اس دشت میں تھا کوئی صید بھی
سو آگئے ہی وہ ہوگیا قید بھی

رہائی ہی مقصود تھی واں سے یار
پڑی اپنی سب کو، کہاں کا شکار

کہوں کیا کہ یکسر تھے اس میں قلم
چلے روسیہ اور سو سو بہم

نہ چھوٹی تھی جا گہ قدم وار بھی
نہ اٹھتا تھا یک نالۂ زار بھی

کہ دل کو کسو کے لگے جوں خدنگ
ہوئے ایسے سن سان جنگل میں تنگ

نکلنا ہوا کھینچ کر یہ عذاب
ملا بیشتر ایک تہ دار آب

رواں تھا کسو کی طرف تند و تیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز

حباب اس کا چشمک زناں موج پر
کہ یوں گرم جاتے ہیں اہلِ نظر

تلبب گار کرتے نہیں سادگی
نہ ہو جوں گہر ایسی استادگی

کنارے پہ اس کے اترنا ہوا
دو بالا ہوئی ٹھنڈ مرنا ہوا

نہ رکھتے تھے جو رند مفلس لباس
نہ ان سے ہوا اپنے جامے کا پاس

غزل کہنے کی یہ بھی جا خوب ہے
جو اچھی ہو موزوں تو کیا خوب ہے

غزل

حیف اس شکار پیشہ کو ہم سے خبر نہیں
ہم ہیں شکار خستہ ہمارے جگر نہیں

ہم خاک منھ سے ملکے پھرے جیسے آرسی
افسوس ہے کہ روے دلِ یار ادھر نہیں

آنکھیں نکال اس کے قدم کے تلے رکھیں
تو بھی ہمارے حال پر اُس کو نظر نہیں

کیا کیجیے جو نہ کیجیے انداز دام کا
گلزار کے تو قابلِ پرواز پر نہیں

نکلی پڑی ہے میان سے کاہے کو ہر گھڑی
لاگ اس کی تیغ تیز کو ہم سے اگر نہیں

سر رکھ کے اس کی تیغ تلے مر چکو شتاب
یاں پاؤں پیٹ پیٹ کے مرنا ہنر نہیں

آنکھیں ہیں اس کی راہ پہ جوں نقشِ پا ہزار
پر میرؔ اس کو کچھ سرِ سیر و سفر نہیں

لیے کتنے زوروں میں بانک و پٹے — جواں اس سے آگے بھی جا کر ڈٹے
نہنگ اس طرف کے بچاروں کے سُن — پلنگ اُن بنوں سے چلے سر کو دھن
غریب اشتلم جنگلوں میں رہا — نہ جھانکا ادھر کوہ سے اژدہا
گیا سیکڑوں کو بس شورِ شکار — رہے ٹھور جیوان یک جا ہزار
چلا باز چھاتی کو کھولے جہاں — پرندہ رہا وہم کا بے گماں
زمیں گرد جرہ ہے کیا تیز بال — رکھا جن نے اٹھتے ہی مرغِ خیال
فلک سیر شاہیں کی پرواز دیکھ — لگے جوں نگہ جا کے انداز دیکھ
نہ جھاڑا گیا نسرِ طائر سے سر — گٹھا کرگسِ چرخ، چھوٹا نہ پر
رواں جس گھڑی ہوتی فوجِ گراں — بھیر و بنہ ہر طرف سے عیاں
زمیں پر قدم کوئی کیونکر دھرے — بیاباں فراخی سے تنگی کرے
کوئی شعبہ آیا مگر درمیان — ہوا شور لشکر سے محشر عیاں
بلندی و پستی تھی اتنی کڈھب — کہ گاہے زمیں گہ فلک پر تھے سب
کوئی نالہ کھولا اگر آ گیا — تو اپنا کیا پھر کوئی پا گیا
گرے یاں، رہے یاں، یہی چال تھی — جہاں در جہاں خلق پامال تھی
ہوا دن تو یوں کھنچتے رنجِ شام — گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام
کہے ہے کوئی آن آتا ہے یہ — پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ
لگے آنکھ کیڑوں کے تئیں زور رہو — پھر آرام سے رات کو سو رہو
ہوا خیمہ گہ دامنِ کوہ سب — رہا آ کے نواب واں تین شب
قریب ایک ٹیبا پہاڑی تھی واں — لگا اس سے کم کم تھا آبِ رواں

پہاڑی کہ تودہ کہوں خاک کا — کہ انبار تھا خار و خاشاک کا
محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت — کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت
ہوا بد بہت اور پانی لگے — قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے
چلے باو تو ایک موحش ہے شور — رکھے پاؤں دامن کو کھینچے بہ زور
فقط خار بن کیا کپڑ پہاڑ تھا — کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکاڑ تھا
چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں — کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں
نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں — مگر پچھلے پاؤں ہی رہرو ہٹیں
کہیں ہاتھی آیا ہے بھڑکا ہے اونٹ — کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ
کہیں ہیں گے انفار سرگرم جنگ — گرے ٹٹو پر تل کا عرصہ ہے تنگ
قیامت نمودار ہر ہر قدم — چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم
کہیں بچ کے نکلے کہیں جھک چلے — کہیں مضطرب تھے کہیں رک چلے
اسی طور منزل کو کر قطع راہ — پہنچتے رہے ہم بہ حالِ تباہ
شجر جمع تھے کچھ نہہ کوہ بھی — فرود آیا اک جا پہ انبوہ بھی
زمیں اونچی اونچی خشونت بہت — اسی سے تھی واں کم سکونت بہت
ولیکن وہی خاک زشت و پلشت — ہوئی بودِ آدم سے رشکِ بہشت
ہوئی بیلچوں سے برابر زمیں — چمن سے بھی شاداب وہ سر زمیں
وہ پانی جو چلتا نہ تھا ڈھنگ سے — کہ تھا رہ گرا سر زناں سنگ سے
صفا اور خوبی میں کچھ بڑھ گیا — کئی ہاتھ مقدار سے چڑھ گیا
غزل اس زمیں پر بھی کہنی ہے میر — دل اپنا ہے لطفِ سخن کا اسیر

غزل

وہ کماں ابرو اگر در پے ہوا ہے میر کے
ترکش ان پلکوں کا ہے بالائے ترکش تیر کے

یوں تو کہتا ہے گلے کا تو مرے تعویذ ہے
پر نہیں آثار ظاہر یار کی تسخیر کے

میں بھی زنجیری رہا ہوں پر گلشن کے قریب
پہنچے ہوں گے دور تک نالے مری زنجیر کے

خون ہی دستِ حنائی سے کیا کرتے ہو تم
لو کبھو ٹک ہاتھ میں دل کو کسو دلگیر کے

بندہ و صاحب میں نسبت ہے ولے نازک بہت
معترف رہتے ہیں عاشق اپنی ہی تقصیر کے

اور بھی وہ رشکِ حور کچھ اب خنک ملنے لگا
معتقد ہم کیا ہوں آہِ صبح کی تاثیر کے

روئے دلکش وہ خدا جانے کہ کس سے کھنچ گیا
میر ہم عاشق رہے ہیں ایسی ہی تصویر کے

پہاڑی ہے لشکر چلا سوے کوہ
چلے بس تو کریے سیہ روے کوہ

پڑی وادیٔ سوختہ بیچ میں
کہیں آب میں تھے کہیں کیچ میں

نیستاں سے ہے خرابہ کڈھنگ
پہ ٹیلے سے عرصہ نہایت ہے تنگ

شجر جنگل ایسے تھے انبوہ سے
کہ ان میں سے جانا ہو اندوہ سے

کہیں بید کے برگ خنجر گزار
کہیں پا نہ رکھنے دیں سر تیز خار

تنک دو درختوں کے اودھر ہوئے
نیستاں پھرتے ہی پھرتے ہوئے

اگر بید آئے تو بن بید باف
نہ آئے نظر دور تک راہِ صاف

اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت
کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

ہمیں چار نالے اُترنے پڑے
کنارے پہ دو دو گھڑی تھے کھڑے

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر | چلے دو قدم راہ پائی اگر

بہت لوگ دشتِ قدم کو گئے | بہت اسپ و اشتر عدم کو گئے

لگی ہاتھ فیلانِ دشتی کی راہ | و لے ڈر نہ ہو فیل کوئی سیاہ

نہ ہاتھی ملا کوئی بارے نہ شیر | ہوئی خیر گو طے ہوئی راہ دیر

شجر سرکشیدہ بہت کیا کہوں | جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

چنار اُن درختوں کے تھے پائمال | سفیدار رکھتے تھے حکمِ نہال

اگر کوئی دریاچہ آتا ہے بیچ | تو لوگوں کی روندن سے ہوتا ہے کیچ

تلِ کوہ رفعت نمودار ہو | گیا آمد و شد میں ہموار ہو

کوئی گل زمیں آئی ایسی نظر | کہ عالم نے اودھر لگائی نظر

کہیں سبزۂ تر سے جی جا لگے | کہیں سرسوں پھولی دلوں کو ٹھگے

نہ تھا پر گلِ زرد دامانِ کوہ | یہی رنگ تھا تا گریبانِ کوہ

فضا دل کشا آب یک سر صفا | شجر خوش نما، نرم نرمک ہوا

چکارے بہت مارے کہسار میں | دو رستہ پکا گوشت بازار میں

یہ انبوہِ اشجار تا شش گروہ | پھر آگے بیاباں وہ ہے اور کوہ

کناروں میں اس کے کہیں کوئی کھیت | وگرنہ یہی سنگ و بے رتبہ ریت

نہ سبزہ کہیں تھا، نہ آبِ رواں | نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال | سیاہی پکڑتی تھی چشمِ غزال

وہی جنگلہ دو طرف بد نمود | مقام اس طرح کے بھی ہیں یادبود

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار | نہ ظاہر ہیں اس کے کہیں لالہ زار

نہ چشمک زناں دور نزدیک پھول — نہ نرمی سے آتی تھی بادِ قبول
چلی باد ایسی کہ جھگڑ رہے — ہوا اور پانی میں پھکڑ رہے
اِدھر باد کا شور اُدھر آب کا — شب و روز مذکور کیا خواب کا
اِدھر کے تئیں ایک تھا آب شار — وہ البتہ شایان سیر و شکار
وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاو — اڑانے نہ دے جو حواسوں کو باو
سوا اپنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ — کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ
بہت شعبہ کوہ مشہور تھا — زبانوں پہ لوگوں کی مذکور تھا
قدم رکھ جو نواب وہاں تک گیا — سر اس شعبے کا آسماں تک گیا
کدھب وہ جگہ سیر گاہ ہوگئی — حضور اس کے فردوس تہ ہوگئی
ہوا خیمہ استادہ ایسی جگہ — کہ آنے لگی دیر واں سے نگہ
رواں دو طرف اس کے اک آب کم — کہ دل کا لیے جاے سب زنگ غم
جہاں تک نظر کیجے مدِ نظر — ہوا موج زن کوہ کی تا کمر
نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے — گرفتہ دل اس جاے کھلنے لگے
وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا — رواں گرم تر سوے صحرا ہوا
بہا دامنِ کوہ میں سنگ پر — کیا سنگ ریزوں کو بھی رنگ پر
کہ لوگ ان کو ہاتھوں میں رکھنے لگے — جواہر کے رنگوں پر رکھنے لگے
کڑاڑوں کا کیا عظم کیجے بیاں — برابر کھڑے تھے وہ کوہِ گراں
انھیں میں سے تھی راہ اِس آب کی — وہیں بھیڑ رہتی تھی احباب کی
ہوے دامنِ کوہ میں کچھ مقام — سفر کی بھی مدت ہو شاید تمام

کوئی روز گھاٹی کی بھی سیر ہے
سبھوں کی ہی معلوم پھیر خیر ہے

جو اس میں کسو شیر کا دیں نشاں
نظر آوے یا کوئی پیل دماں

تو اور ایک دو دن کی ہوتی ہے دیر
وہ ہاتھی بندھے کیجئے گا یا وہ شیر

شکار ایسا دیکھا ہے اس بار کا
کہ جھاڑا ہوا دشت و کہسار کا

کوئی دیکھے کب تک پہاڑ اور جھاڑ
ٹلے چھاتی پر سے کہیں یہ پہاڑ

غرض ہے وزیر جہاں ارجمند
رئیس کلاں کار، عالم پسند

در اس کا ہے باب سجود سراں
رہیں حکم کش اس کے زور آوراں

سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار
جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

بہانے نہ کر میرؔ اب شاخ شاخ
غزل کہہ زمیں گو کہ ہے سنگلاخ

غزل

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند
جراحت نے کیے ہیں چشم تر بند

گیا ہے وہ سو دل کھلتا نہیں ہے
پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند

کریں ہیں شوق گل میں خون دل ناچار
اسیران شکستہ بال و پر بند

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

بہت ہے یار کا کم بولنا بھی
نہیں چنداں ہم ان باتوں کے در بند

سبھوں سے آرسی کے مثل وا ہو
کسو کے منہ پہ دروازہ نہ کر بند

ہمارے ہاتھ خنجر سے کرو قطع
نہ کھلوایا کبھو اس کا کمر بند

رکھے ہے یار آنکھیں ہی دکھا کر — ہم اس کے ان دنوں میں ہیں نظر بند
نہ خط آتا ہے اُدھر سے نہ قاصد — لکھوں کیا مدتوں سے ہے خبر بند

غزل کا قافیہ تغئیر کر میر
ہنر کچھ اس زمیں میں میر کر بند

غزل

جگر خوں کن ہیں خوبانِ حنا بند — دل ان کے دستِ رنگیں کا ہے پابند
گرہ بندِ قبا میں دے ہمیں دیکھ — ہوا کیا آہ باغ دل کشا بند
رکھ آہِ سرد ہی سے گرم جوشی — رکے ہے دل جو ہوتی ہے ہوا بند
ہمیں سے کیا وہ جادو گر نہ بولے — کسو دشمن نے اس کا منہ کیا بند
نہیں تھمتا ہے اب پلکوں سے رونا — بہت خاشاک سے دریا رہا بند
ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید — کھلی ہو چشم جوں آئینہ یا بند
نہیں کام آتی اتنی تیز گامی — سمندِ عمر ہوتا کاش جا بند
زبردستوں کی کشتی ہو گئی پار — نکالا عشق زور آور نے کیا بند

یہی انداز باندھے ہیں یہی ناز
قیامت میر صاحب ہیں ادا بند

---

(۱۰)

صیدنامۂ سوم

مکرر ہے نواب کو قصدِ صید — بیاباں پہ ناور اب ہوں گے قید
رواں بحرِ لشکر ہوا موج موج — گئی چشمِ خورشید تک گردِ فوج
بحار و صحاریِ پہ ہے عرصہ تنگ — مگر یاں سراسیمہ ہیں واں پلنگ
پہن بیٹھے ہیں شیر ببری لباس — کریں لوگ شاید فقیری کا پاس
چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند — دلوں میں ہراسِ کمان و کمند
کہیں گرگ وادی کو فکرِ گریز — نظر اِدھر اُدھر کرے تیز تیز
بنوں میں ہے آشوب کوہوں میں ڈر — بیاباں وطن سارے گرمِ سفر
کہیں امن ہو تو کھوں واں گئے — نکل آکھروں سے پریشاں گئے
اسد کی نہ شیرانہ ہنکار ہے — نہ گفتار کو تابِ رفتار ہے
جہاں کے نہاں فکر میں ہیں کھڑے — کہ ڈنگل سے جنگل میں کیا بن پڑے
ہوا دودِ باروت سے تیرہ رنگ — صدائے تفنگ و صدائے تفنگ
وحوشِ بیاباں کو وحشت غضب — ہوا میں کھڑکتے ہی پتے کے سب
ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے — ہوا ہی میں پنچھی پکھیرو جلے

گئی باد جو آسماں سے پلٹ
کلنگوں کی صف باز نے دی الٹ

اڑے ہاتھ دو چار جرّے کہاں
رہے مرغ آبی جہاں کے تہاں

پرِ تیر جس دم کشادہ ہوے
بڑے صید حد سے زیادہ ہوے

بنوں میں مچی دھوم سی آکے دھوم
جہاں دیکھیے ہے قیامت ہجوم

کہیں ارنے مارے غضنفر کہیں
کہیں ہاتھی نکلا ہے اژدر کہیں

بڑے مست ہاتھی جو تھے من چلے
سُن اس شور کو چھوڑ کر بن چلے

نہ تیرہ ہے روز گوزنان و گور
کہ شیروں کو بھی قشعریرہ ہے زور

لبِ آب جاکر جو کھیلے شکار
اسدواں کے تھے کودکِ نے سوار

ہوے قرقرے صید ہو ہو کے ڈھیر
ہوا میں سے بھاگا عقابِ دلیر

زغن اِن بنوں میں نہ پائی گئی
نہ تن دار کی لاش اٹھائی گئی

ہوا ہے یہی تو یہ ہوتی نہیں
کہ ہو قاز آکر سیاہ یاں کہیں

جگر کیا کہ پرزن ہو اس بن میں زاغ
یہ زہرہ نہیں رکھتے کوہی کلاغ

شتر مرغ، سیمرغ از بس ہراس
نہیں آتے کوہِ شمالی کے پاس

غزل کہہ کہ ہے میر لطفِ ہوا
بیاباں خوش آیندہ و خوش فضا

غزل

سبزہ ہے آب جو ہے فصلِ بہار بھی ہے
سرگرم جلوہ دیکھو پہلو میں یار بھی ہے

یہ تو نہیں کہ ہم پہ ہر دم ہے بے دماغی
آنکھیں دکھاتے ہیں تیغ چتون میں پیار بھی ہے

گل ہم کنار ہوگا ہنس کر کبھو چمن میں — پر کم بغل ہے بلبل اس کو قرار بھی ہے
ہوں وعدہ گاہ میں تو پر میں ہی جانتا ہوں — کچھ اضطراب بھی ہے کچھ انتظار بھی ہے
جوں موج ہم بغل ہوں نایاب اس گہر سے — دریا کی سیر بھی ہے بوس و کنار بھی ہے
ہم جبریوں سے کیا ہو بے تہ و پا دعا جز — کہنے کو کہتے ہیں یہ کچھ اختیار بھی ہے
گو ان میں بھبھوکا سا ہے دیکھو نا ٹک بھی تو وہ — شمع و چراغ و شعلہ برق و شرار بھی ہے
جانا مسلم آیا اس خاکداں سے گو پھر — مشکل گذر ہے رستہ گرد و غبار بھی ہے

دل تنگ میر کیوں ہے ہم رہ وزیر کے تو
دریا فضا ہوا ہے سیر و شکار بھی ہے

اٹھا فوج میں سے یہ گرد و غبار — کہ منھ پر تھا خورشید آئینہ دار
فلک گھر سے تھا دھواں سا نمود — سماں شب کا رکھتا تھا ٹک شہود
زمیں تھی سو تھی فرش بالائے آب — تخلخل سے مطلق نہ گھٹتی تھی تاب
نہ پوچھو کہ لوگوں کا کیا حال تھا — جو رکھے قدم واں تو بھونچال تھا
روندے لگے چلنے تیزی سے چال — ہوا مذہب شیعیاں اعتزال
کسو ڈھب سے جوں توں کے چلنا ہوا — عجب مہلکے سے نکلنا ہوا
اُتر لوگ دریا سے آگے گئے — ہزبرانِ خوں خوار بھاگے گئے
پلنگانِ مردم در ایسے ڈرے — کہ جاتے ہیں کوہوں کے چھوڑے درے
بیاباں میں مرنا کہاں سر دھریں — نہ لیں راہ بر رعب کیا کیا کریں

غزل میر یاں کہہ اگر ہو دماغ
کہ کے دل ہمارے بھی ہوں باغ باغ

غزل

تھی باو بھی آنے کی چمن میں نہ رواوار
پر کیجیے کیا گل کی صبا بھی ہے ہوا دار

شایستۂ دیدن ہے مرے یار کی صحبت
وہ صاحب ناخواہ ہے بندہ ہے وفادار

کیا خوب ہو کیا زشت ہو رو دیکھے ہے سب کو
اس عرصے میں آئینہ کو دیکھا ہے ہوا دار

کس طور سے یک رنگ ہو یہ عاشق و معشوق
ہے گل کنے زر بلبلِ بے برگ ہے نادار

کیا بے کسی سے میرؔ نے رحلت کی جہاں سے
رویا نہ کوئی اس پہ نہ کوئی ہے عزادار

بنوں میں پھرا کرتے ہیں ہم تو دیر
نہیں بولتے ڈر سے غرندہ شیر

رہے تھے جو فیلانِ مست آن کر
گئے کجلی بن یاں سے ڈر مان کر

جو اُن میں سے آ کر لڑا بھڑ دیا
سو کٹھ بند ھضوں سے ہوا فیل پا

گریوے کہیں تھے بلند اور پست
پھر اڑتے تھے واں جیسے پیلانِ مست

بہی تیغ نواب اس طور سے
بہے جدولِ تیز جس طور سے

بہت رہ گئے زیرِ شمشیر و تیر
بہت آے لشکر میں ہو کر اسیر

لدے ہاتھیوں پر جو ہو کر شکار
ہوئیں بوجھ سے پشت فیلاں فگار

کیے گم جو گینڈے نے اپنے حواس
کھڑا ہو رہا آ کے بھینسوں کے پاس

کہ بھینس اس کو بھی جان کر لشکری
چلے جائیں صرصر نمط سرسری

نہ چھوڑا ہے طیر ایک عصفور تک
نہ وحشی کہیں اور لنگور تک

لگے جا کے شاہینِ دستور یوں
پڑے بکریوں میں کہیں گرگ جوں

کلنگ ایسے بازوں سے آئے ستوہ
که کابل سے آگے گئے صد گروہ
نہیں قوچ سرزن نہ آیل فرنگ
ہوئے قید یا صید کیا بے درنگ
غضب کر گئے جرّے نواب کے
اڑا کھا گئے خیل سرخاب کے
نہ لگ لگ نہ تیتر رہا دشت میں
نہ غمخوار اک آیا نظر گشت میں
سبھوں میں جو تھے قاز و سارس سرس
ہوئے صید یوں جن پر آیا ترس
حواصل کو ہوتا اگر حوصلہ
تو گرتا نہ کھیتوں میں ہو دو دلہ
کہیں سارے طاوس مرتے رہے
ادھر لوگ افسوس کرتے گئے
کہیں جی اٹھی تھی زمیں بعد مرگ
نہال اس کے خوش قد و بسیار برگ
نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے
نظر جاے جس جا تلک سبز تھے
ہوا دل کش و ہر طرف سبزہ زار
کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار
کھڑے لوگ محوِ تماشا تھے واں
کہ کہنے لگی بلبل خوش زباں
کہ خاطر جنوں سے نہ رکھیے نچنت
خبر بھی ہے تم کو کہ آئی بسنت

یہ عہدِ جنوں ہے جنوں کیجیے
جگر کو غزل کہتے خوں کیجیے

غزل

بلبل کے بولنے سے آزار دل نے پایا
کیا کہہ گئی کہ ہم کو سنتے ہی غش سا آیا
نخچیر گاہ میں اس کے جاتا نہیں ہے کوئی
ہم کو تو شوقِ مفرط واں کا لگا کے لایا
انواعِ رنج ہم نے کھینچے تھے عاشقی میں
پر ہجر کے الم نے چنگا بہت بنایا

صوفیٔ صاف مشرب بے ہوش و بے خرد ہیں
مستی نے اس نگاہ کی مجلس کے تئیں چھکایا

مہر و وفا و الفت کرتے تھے لوگ باہم
رحمت خدا کی تم نے اس رسم کو اٹھایا

سر مارے تو پری کو ایسی روش نہ آئے
کس ناز سے زمیں پر پڑتا ہے اس کا سایا

یہ جانتا تو ہرگز بازار میں نہ جاتا
یوسف کے طور میں بھی سستا بہت بکایا

غیرت ہے عاشقی کے جاتا نہیں ہوں میں تو
وہ خود بہ خود ہی آوے کاش اس طرف خدایا

معشوق تو ہے پردہ اوباش کج روش ہے
کیا کہیے میر جی نے دل کو کہاں لگایا

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا
کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا

نظر گرد لشکر پہ تھی دم بہ دم
نہ تھا واں کے ضیغم کو کچھ اور غم

کوئی ارسلان بھیجتا گر رسول
تو شاید کہ الحاح ہوتی قبول

سوئے خواں گرفتہ تو بھولے ہوئے
بہت اپنے زوروں پہ پھولے ہوئے

چلی ہر طرف اب جو آکر تفنگ
نہ اوقاتِ صلح و نہ ہنگام جنگ

لگی آگ جنگل میں چارا گیا
بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا

ہوا چہرہ کوئی تو جوں شیرِ سنگ
نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ

لگی گولی پڑنے، نہ پھر چل سکا
نہ جاگہ سے اکسا نہ ٹک ہل سکا

چلے ہم جو بھرتراج سے پیشتر
ہوئے صید دریا کے واں بیشتر

بھرے فرط ہی سے تو دیہات و شہر
کہے تو کہ سونتے گئے رود و نہر

گھٹے گولیوں سے مگر بے شمار
رہے سونس گھڑیال چندیں ہزار

جو کچھ زخم پانی میں لے کر گئے
وہیں رہ کے ناسور مر مر گئے

لگا کہنے باخا سر اپنا جھکا ۔ کہ پانی تو جالوں سے سارا رُکا
اگر جائیے تہ کو دھس جائیے ۔ وگر گاڑھیے سر تو پھنس جائیے
عجب مخمصہ ہے بچے کیونکہ جاں ۔ یہی موت ہی سوجھتی ہے نداں
جواب اس کا گھڑیال نے یوں دیا ۔ گھڑی ایک دو کا ہے قصّہ رہا
پڑی سر پہ بجتی ہے فرصت نہیں ۔ پھر اس کو کھنچتے ہیں اب کیا کہیں
تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہو ۔ کریں کیا اگر یوں ہی تقدیر ہو
کوئی دشت یک دست نے زار تھا ۔ رکھے واں قدم پاؤں افگار تھا
یہی سنگ یا کانس پانی کی گھاس ۔ زمین و ہوا آب و آتش اُداس
کہیں دوں لگی ہے تمامی ہے دود ۔ کہیں دو شجر ہیں سو کیا بد نمود
نہ پتا نہ شاخیں نہ کچھ ان کو بار ۔ سراپا ہے خشک و زبوں زرد و زار
نہ سایے سے اُن کے کوئی بہرہ مند ۔ نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند
سیاہی نہ ہرنوں کی ڈاروں نے کی ۔ نہ چشمک کہیں سے چکاروں نے کی
کہیں لپٹے آپس میں دو چار نے ۔ کہیں ہاتھی آیا کہیں شیر نے
کہیں سر پٹا سر پہ تھا جیسے تیغ ۔ روندوں کے پاؤں پر آیا دریغ
نہ بلبل غزل خواں نہ طیروں کا شور ۔ سبھی دیکھتے میر کے منھ کی اُور

سو اُن نے غزل ست سی یہ کہی
ولے دل کو لوگوں کے لگتی رہی

غزل

ذوقِ شکار اس کو ہے اتنا کہ حد نہیں ۔ کس اس کی تیغ کش پہ ملک کو حسد نہیں

خالی پڑے ہیں صید سے وادی و کوہسار
رہنے دو وحش و طیر کو اب دام و دد نہیں

بے جد و کد جو اس سے ملاقات ہو تو ہو
تم کد سے دیکھو ہو کہ ہمیں اس کی کد نہیں

کچھ اور شے ہے خوب جو دیکھو رُخِ نگار
ہر چند گل بھی تازہ کھلا اتنا بد نہیں

اس بے کسی سے کون جہاں میں موا کہ ہیں
جز داغ سینہ آج چراغِ لحد نہیں

کیا سرو و گل سے ہووے تسلیٔ اہلِ شوق
گل منھ نہیں ہے یار کا سرو اس کا قد نہیں

بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

سو بار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم
رسوائی کے طریق کے کچھ نابلد نہیں

لطفِ سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میرؔ
اب شعر ہم پڑھے ہیں تو وہ شد و مد نہیں

کسو ایسے بن سے نکلنا ہوا
کہ کوسوں تلک اس میں چلنا ہوا

کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت
چمن کے سے نوباوگان سبز بخت

برابر برابر کھڑے سر بسر
پھرے دیر اُدھر کو جا کر نظر

پرے چل کے آیا ترا کم بہت
جو اس اس میں جا کر ہوے گم بہت

کہیں راہ نکلے تو چلتے پڑے
رہے بال و پر تل بہت واں کھڑے

کہ شاخوں نے جھک جھک ملائے تھے سر
بہت آگے جا جا کے آئے تھے پھر

وہی راہ درپیش و کثرت ہوئی
قیامت کے اوپر قیامت ہوئی

سروں پر اُدھر توپ آئی چلی
پڑی تھی اُدھر لوگوں میں کھل بلی

کہیں اسپ و اشتر کہیں فیل مست
زمیں ہر سرِ گام بالا و پست

گزر جس طرح اس طرح سے کیا
روندوں نے خونِ جگر ہی پیا

وہیں بیچ آیا میانا مرا
کوئی دیکھتا رنج اٹھانا مرا
سواری سے مجھ کو ندامت ہوئی
کہ چاروں طرف سے ملامت ہوئی
لگے کہنے آیا فرنگی کہاں
کہ چوپالے کی رسم چھوڑی ہے یاں
جسے دیکھو چار اُن نے رکھ کر کہار
لگا ہونے ہر صبح اس پر سوار
چلو ہی چلو ہے کہ بچ جائیو
کہ چوپالے کے پاس مت آئیو
روندے اِدھر کے اُدھر ہیں خراب
یہ جاتے ہیں مجرے کو بھاگے شتاب
چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی
لیا اٹکل اِس سودے میں نفع بھی
کہ گھوڑے دیے چھوڑ یک بارگی
میانوں میں کرتے ہیں آوارگی
نہ اس حال سے اہلِ دفتر خبر
توجہ نہ عمدوں کی کچھ ہے اِدھر
وگر نہ ہو قدغن کہ اب اہلکار
نہ رہنے دیں لشکر میں ڈولی سوار
نہ مانیں تو چوپالے دیویں الٹ
ابھی گھوڑے لیں ڈپٹے ایک ہی ڈپٹ

کرو میرؔ بحر اور اب اختیار
مگر اس سے نکلیں دُرِ آب دار

غزل

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں
تیغ دریغ نہیں اس کی بسمل گہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکارِ لاغر ہم پر ایک اُمید پر آئے ہیں

تُل کر سامنے یوں ہی اب جو تیر ترازو ہو اُس کا

کیا کیا لوہو پی کر دل کو اِس پتلے پر لائے ہیں

خم سے لگی میخانہ کی دیوار بھی اپنے گھر کی ہے

لطف پیرِ مغاں سے عجب کیا ہم آخر ہم سائے ہیں

شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہیے

اچھے اپنے جی کو ہم نے آپ ہی روگ لگائے ہیں

محوِ سخن ہم فکرِ سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں

آپ کو جب کھویا ہے ہم نے تب یہ گوہر پائے ہیں

دیکھیں طرف ہے کون سی جس سے تیغِ ناز بلند کرے

ہم نے بھی تو اس ہی جہت سے فرقِ نیاز جھکائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی

ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کس کو ایسی بے خبری تھی جس کے بولے تو چونکا

سو ٹھوکر نے ان پلکوں کی کتنے فتنے جگائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا اُستادِ فن عیاری کا

اتنے سن میں جن نے تجھ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میرؔ مقدس آدمی ہیں تنھے سبحہ بہ کف میخانے میں

صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

کیا ایک نالے سے ہم نے گزر   ہوئی قائم اُس جا پہ حشرِ دگر

گرے گاڑی چھکڑے پیادے سوار
کہ مقصد تھا سب کا عبور ایک بار

گزارا جو فیلوں کا پہلا ہوا
ملا خاک میں آب پھیلا ہوا

کمر تک لگے پھنسنے دلدل کے بیچ
کہ نالے کا پانی تھا ایک دست کیچ

پھنسے گاؤ اشتر گرے بارِ خر
ہوا اسپ و اشتر بھی زیر و زبر

اگرچند باندھے تھے دو جسرِ خام
ہوئے ایک ریلے میں دونوں تمام

نہ دیکھے تھے آگے کبھو یہ سمیں
و لیکن خدا نے اُتارا ہمیں

سلامت رہا اپنا اسباب سب
رہے لوگ لشکر کے کرتے عجب

چلے واں سے آگے بنڈیلا ملا
کیا ان نے ایک ایک کو دو دلا

عجب راہ پُر خوف مشکل گزار
نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار

خطر شیر کا شور بنگاہ کا
عجب واں کے جانے کا غم راہ کا

کہ جا و زمیں کچھ ہویدا نہ تھی
کہیں اس میں پگڈنڈی پیدا نہ تھی

گڑھے غار پاؤں کی لغزش بلا
چلے پاو تو نے کی لرزش بلا

صدا برگِ نَے کی نہایت مہیب
طریقِ عجیب و مسافر غریب

جنوں پیشہ و دشتِ وحشت شعار
کہ فیل اس کے طفلانِ بازی مدار

کہیں پانی آیا سو حالت خراب
کہ تھا زیرِ کاہ اس میں ہر جائے آب

نہ ہاتھی نہ اسباب اپنے گئے
یہی اک میانا بنے سو بنے

چنانچہ گئے راوتی کے کنار
نہ ربط آشنائی کسو سے نہ پیار

کھڑے ہم رہے ہاتھ پر رکھ کے ہاتھ
کریں پار جانے کی کس منہ سے بات

کہار اک میانے میں اپنے دیے
پھر اس کے جو تھے چاروں ہم نے لیے

چڑھے ان کے سر آں روے دریا ہوے ہوے پانی پانی کہ رسوا ہوے

نہ جانا کہ آتا ہے کس کا قدم کہ صید بیاباں گئے کرکے رم

گوزن ایک دو مار لاوے کبھو اڑے باز جرّے کہیں ایک سو

نہ صید ایک دیکھا پھرے لاکھ رنگ

غزل میرؔ نے بھی کہی اور ڈھنگ

غزل

اک درج موتیوں کے عوض ہاتھ آگیا یوسف ہزار حیف کہ سستا بکا گیا

جانا نہ تھا سرھانے سے مجھ مختصر کے ہاے کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ منھ چھپا گیا

آشفتہ سر ہیں سرو گریباں دریدہ گل بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اٹھا گیا

گل برگ سے بھرے تھے کبھی تو کنار و جیب کیا کیا ہمیں نہ گریۂ خونیں دکھا گیا

خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں چلی گئیں قاصد کے پیچھے دور تلک میں لگا گیا

روتا ہوں یوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے مینھ جوں ابر میرے دل پہ غمِ عشق چھا گیا

جو نقش روزگار کے صفحے سے محو ہو صورت پذیر پھر نہیں ہوتا مٹا گیا

ہستی مری کہ ہیچ تھی میں منفعل رہا اس شرم سے ندان زمیں میں سما گیا

داغِ دلِ خراب شبوں کو جلے ہے میرؔ

عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

چلے صبح گاہ دامن کوہ کو تماشا کناں فوج و انبوہ کو

درختوں میں چلنا تو دشوار تھا ولے راستہ بھی قدم وار تھا

گزارا ہوا یوں ہی اک آدھ کوس — پٹیلے یہ ہنگامہ آرا تھی اوس

نیستاں میں چھپنا تھا گھوڑے سوار — اگر ہو تو واں شیر کا ہو شکار

نہ رہتے تھے سو شیر شرزہ بھی واں — نہ ہاتھی کے پاؤں کا پایا نشاں

پٹیلے سے کیلے کا جنگل ملا — پھر آکر وہیں یہ جو دنگل ملا

عجب کش مکش درمیاں آگئی — بہیر اک بلا تھی جہاں آگئی

نہ ہلنے کی جاگہ نہ چلنے کی راہ — سروں پر کھڑے اسپ و فیلِ سیاہ

خطرِ فیلِ دشتی کا ہر ہر قدم — گئے شیر کے ہر قدم پر قدم

کنارِ آب کے لوگ اترے تمام — ہوے دامنِ کوہ میں کچھ مقام

سرِ کوہ کیونکر نہ ہو چرخ سا ے — کہ نواب واں سیر کرنے کو جاے

رہے آب پر فرش و چوکی و تخت — تھے رود و کوہ و زہے ان کے بخت

ہمارا تو جانے کو چاہا نہ جی — کہ تجھے بیر ہم واں ہوا خواب تھی

رہی منعقد بزم، تھا ناچ راگ — نہ ہو کچھ تو کیونکر ہو یہ دل کی لاگ

کہی اور ہی بحر میں یہ غزل
مگر میر کو ہے دماغی خلل

غزل

کر لطف عارض مت چھپا عاشق سے اے یار اس قدر
یک جان کو یہ عارضے یک دل کو افکار اس قدر

جو کچھ ہے سو دل کا سبب غم غصہ و رنج و تعب
تجھے چاہنے سے پیشتر کاہے کو بیمار اس قدر

ہر دم جو اس کے ابرواں جنبش میں ہیں کانپے ہے جاں
یعنی ہے آنکھیں جھپتیاں چلتی ہے تلوار اس قدر

شب نالہ و زاری رہے دن خستگی خواری رہے
وہ دل نہیں باقی رہا کھینچے جو آزار اس قدر

وے دل زدے ہیں خستہ جاں مر جاتے ہیں جو ناگہاں
ورنہ قضا کس شخص کی پہنچی ہے یک بار اس قدر

طرّے سے طرّاری کرے مستی میں ہشیاری کرے
آیا نظر اب تک نہیں طرّار و عیّار اس قدر

الفت کہاں کلفت ہے یاں یہ بھی عجب صحبت ہے میاں
بیزار وہ اس مرتبہ جس سے ہمیں پیار اس قدر

تم آگے تھے کب بدگماں سب حجت و یکسر زباں
اب یک سخن پر مہرباں کرتے ہو تکرار اس قدر

آنکھیں کھلی ہیں میرؔ کی جب دیکھو تب آئینہ ساں
آدم نہیں ہوتے کہیں مشتاقِ دیدار اس قدر

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب
کہ قدر اُن کی جوں قدر یاقوت ناب

لیے عمدے ہاتھوں ہیں دیکھیں بہا
کہ ہر شئے کا ہے وقت لیل و نہار

اسی آب کا راستی یاں ہے نام
ہیں ساتھ اس کے ہے ربط تمام

کنارے کنارے اسی کے ہے راہ
چلے جاتے ہیں گو نہ ہووے نباہ

جہاں تک ہے آب خراب جائیں گے
سمیں دیکھیں گے جو نظر آئیں گے

جبل سے ہوئے ظاہر آثارِ آب — برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب

ہمیں پر نہیں کچھ ہوا کا ستم — کہیں گرگ وادی کو بھی ہے یہ غم

کہیں ایسے سکڑے ہیں حیوانِ دشت — کہ ٹکڑے کرو تو نہ ہوں گرم گشت

نہ نکلے ہے ہاتھی نہ بولے ہے شیر — کوئی یوز پکڑا ہے سو بعد دیر

اسد یک طرف یوز یک سو رہے — عجب یہ ہے باندھے گئے اژدہے

نہ پوچھو کھچا دور کارِ شکار — نہ اب دشت و در میں نمر ہے نہ مار

شکار افگناں راہ کرتے تھے طے — ملے جاتے تھے خاک میں دشت نے

نہ بیروں کو جنگل میں طاقت رہی — نہ نگروں کو پانی میں فرصت رہی

اسد مارے جاتے تھے سگ کی مثال — بندھے آتے تھے یوز و گرگ و غزال

ملا ایک چھقرا اگر یا گڑھا — تو کثرت سے نو نیزہ پانی چڑھا

بہت مشکلوں سے کیا ہے عبور — کہ اک گام راہ اور سو سو فتور

غزل بحرِ کامل میں نہ وار کہہ
کہ اڑ جائے میر اس بحیرے کی تہہ

غزل

نہ دماغ ہے کہ کسو سے ہم کریں گفتگو غمِ یار میں
نہ فراغ ہے کہ فقیروں سے ملیں جا کے دلّی دیار میں

نہ چمن میں جاتے رہا ہے دل نہ بتوں میں پھرنے لگا ہے دل
وہی بیکلی رہی جان کو رہے سیر میں کہ شکار میں

کہے کون صیدِ رمیدہ ہے کہ ادھر بھی پھر کے نظر کرے
کہ نقاب الٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں

تری شامِ خط کے قریب کے جو صفا میں دیکھی ہے خوبیاں
نہ سمیں یہ گل میں نظر پڑے، نہ یہ رنگ صبح بہار میں

کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارہ ہے
یہی دل جو لے کے گریں گے ہم تو لگے گی آگ ہزار میں

جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کے ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

مرے ایک دل میں جو غم یہ ہے سو فزوں ہے میر شمارے سے
نہ تو دس میں یہ نہ پچاس میں نہ تو سو میں یہ نہ ہزار میں

بڑے جانور خوار کیا کیا ہوے
بندھے پائے فیلاں سے رسوا ہوے

بہت نالے کھولے پچھالے گئے
بحیروں سے رو رو نکالے گئے

نگر کی پس از مرگ عزت ہوئی
کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی رخصت ہوئی

کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب
کہ جھینگوں نے کی شرح کشاف اب

نہ تیتر بٹیر اور کبوتر ملا
دیے باز جرّوں کو سارے کھلا

کہیں بحری پانی میں یوں جا لگے
کہ پنجوں میں لے صید ادھر آ لگے

ہوا میں سے یوں گراتا رہے کلنگ
کہ بازوں نے چڑیا سے مارے کلنگ

کسو اُور ارنوں کو دیکھا کھڑے
کہے تو بیاباں میں ہاتھی پڑے

جگر کر کے جاتے تھے مردان کار
تو وہ ایک دو کر ہی لاتے شکار

وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا
قریب اس کے جانا بہت دور تھا

نہ ان چار شانوں کا روکش ہے شیر
نہ سو فیل دو چار رکھتے ہیں گھیر

مددگار تھے حضرتِ زندہ فیل
پکڑ لاتے تھے لوگ تب زندہ فیل

بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم
اٹھا کرتے تھے لجّے، لطمے بہم

ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر
کنارے پہ گرداب غرقاب قہر

یہی جنگل ان جھیل کے آس پاس
درختوں کا انبوہ نے کا اگاس

اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ
اسی بن میں گور و گوزن اور رنگ

اسی بن میں ہاتھی، وہیں کرگدن
وہیں قوچ سرزن اسی میں ہرن

اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے
وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے

اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ
اسی بن میں یہ صید بندی کا چاؤ

اسی بن میں تھے حضرت بو حمید
اسی بن میں نسناسی ان کے مُرید

اسی بن میں تھے خوک جا موش رنگ
کیا اس سور بن نے لوگوں کو تنگ

اسی بن میں رہنا اسی بن میں راہ
وہیں شام کا حسن، لطفِ پگاہ

اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت
ہوئے صید برّی و بحری بہت

وہیں مچھلی بکتی تھی دمڑی کی سیر
ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر

کہ اس آب کا ہضم دشوار تھا
کہ جوں آب شمشیر دم دار تھا

شغال اور خرگوش جی سے گئے
شکاری سگ ان کو اچک لے گئے

غزل سے لگا ہے بہت میر دل
کہ اس مثنوی میں کہیں متصل

غزل

ہیگی طلب شرط یاں کچھ تو کیا چاہیے
بیٹھے نہیں بنتی میاں کچھ تو کیا چاہیے

عشق میں اے ہمرہاں کچھ تو کیا چاہیے
گریہ و شور و فغاں کچھ تو کیا چاہیے

ہاتھ رکھے ہاتھ پر بیٹھے ہو کیا بے خبر
چلنے کو ہے کارواں کچھ تو کیا چاہیے

میں جو کہا تنگ ہوں مار مروں کیا کروں
وہ بھی لگا کہنے ہاں کچھ تو کیا چاہیے

سوں کھنچے رہنے کی کس نے بدی ہے بھلا
لطف و غضب مہرباں کچھ تو کیا چاہیے

کام اب اپنا ہے یاں کندنِ جاں ہر زماں
کیا کریں ہم ناتواں کچھ تو کیا چاہیے

کیا کروں دل خوں کروں شعر ہی موزوں کروں
چلتی ہے اب تک زباں کچھ تو کیا چاہیے

ہو نہ سکے گر نماز دل کی طرف کر نیاز
وقت گیا پھر کہاں کچھ تو کیا چاہیے

چاہوں ہوں کسو سے دعا دل کی کروں اب دوا
نفع ہو پھر یا زیاں کچھ تو کیا چاہیے

عمر گئی لغو سب وقت بہت کم ہے اب
کچھ نہ کیا ہائے میاں کچھ تو کیا چاہیے

یہ تو نہیں دوستی ہم سے ہی جو تم کو ہے
پاس دل دوستاں کچھ تو کیا چاہیے

تو نے کماں کی ہے زہ پر ہوں زبوں صید میں
میری بھی خاطر نشاں کچھ تو کیا چاہیے

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نامِ خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

کنارے پہ تھی اس کے اک گل زمیں
سراسر ہری جوں زمرد نگیں

جہاں تک نظر جاوے شاداب تھی
کہ یک دست واقع لبِ آب تھی

وہیں خیمے سب کے ہوئے تھے کھڑے
وہیں دام رہتے تھے اکثر پڑے

نواڑوں کی سیر اس میں ہر شام گہ
وہی سیر گاہ و وہی دام گہ

وہیں صید ہوں مرغ و ماہی تمام
مقام ایسے ہوویں تو کریے مقام

ہوا خیمہ آکر جو نواب کا
فلک سائے تھا فرق اس آب کا

ہوا ہوتا واں کاش وہ آبِ رز
ہوے جیس ہی شایستہ سیر نغز

عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجب
کہ دیں چھوڑ ناویں دیے بھر کے سب

جدا ہوویں تو غنچہ غنچہ چراغ
ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ

ورے روشنی شعلہ انگیز نار
پرے سطح پانی کا آئینہ وار

ہوئیں کشتیاں کچھ ورے سے پرے
چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے

حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب
حبابی تھا آئینہ سب سطح آب

نمودار چرخ پر انجم تھی شب
دیوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب

غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ
لگا دی ہے گویا کہ پانی میں آگ

غزل میر کوئی کہا چاہیے
کسو تو زمیں پر رہا چاہیے

غزل

کب آوے گا کیا جانے وہ سرو قامت
ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت

نمازِ سفر ہے اشارت اسی سے
کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقتِ اقامت

رہا رابطہ غارتِ دل تلک بس
نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت

گریباں کو گل چاک کرنے لگیں گے
کھلے رکھ گلستاں بندِ قبامت

اٹھا کر نہ یک زخمِ شمشیر اس کا
غزالِ حرم نے اٹھائی ملامت

بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے
کسی بے وفا سے دل اپنا لگامت

کوئی فصلِ گل میں بھی توبہ کرے ہے — رہے گی ہمیں دیر اس کی ندامت
کہیں دل کی لاگیں لگیں چھپتیاں ہیں — کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت
گئی سو گئی پیشتر تھی جوانی
رہِ عشق میں **میر** آیندہ جامت

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہ نامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شاہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستاں — ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدولہ ہیں نے بھی **میر** — کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو — گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
زہے آصف الدولہ دادگر — سخنور نواز اور عاشق ہنر
دہش سے جہاں اس کی رونق پذیر — وزیر ابنِ دستور ابنِ وزیر
کرمی کرے تو جہاں در جہاں — کفِ جود و خورشید ساز رفشاں
سراپا ہے احساں تمامی ہم — ہمہ تن مروت، سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار
قفائے غزل یک رباعی کہو — سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو **میر** بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر لے کر چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

غزل

کرو تامل کہ حال ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
جو کچھ بھروسا جنھوں پہ تھا سو شکیب و تاب و تواں سدھارے

ہوئے ہیں غائر قیامت اب تو گئے جگر تک گئے ہیں دل تک
جو ٹک بھی دیکھے وہ غور سے تو جراحت ان کو دکھاویں سارے

ہماری آنکھیں بہیں ہیں اتنی کہ اب ہے دریا محیط عالم
کہیں کہیں جو رہیں ہیں مردم سو بیٹھے ہیں وے کیے کنارے

کریں تحمل سو کا ہے پر ہم مدام بیخود ہمیشہ غش ہے
گئی ہے طاقت دلوں سے شاید نہیں ہے آیا جگر ہمارے

کبھو سروں پر ہے تیغ نالہ کبھو سنان فغاں جگر پر
کسو سے کہنے کا کچھ بھی حاصل گئے ہیں جوں تیں کے وقت بارے

بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل و جگر میں جو نصف شب کو
لگا جو رونے تو جائے آنسو مری مژہ سے گرے شرارے

قبول عشق و محبت اتنا ہوا ہے اے میر سیر قابل
مدام جائے دکھائی دوں ہوں کبھو نہ ان نے کہا کہ آ رے

رباعی

چلنے کو ہوئے بادیے سے ہم جو کھڑے
مل چلنے کے اتفاق بہتیرے پڑے
مجنوں نے کہا تھا میں بھی آتا ہوں میر
آیا نہ رہے راہ میں ہم دیر کھڑے

(۱۱)

کتخدائی آصف الدولہ

ہے جہانِ کہن تماشا گاہ — آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ

آؤ ساقی کہ کدخدائی ہے — طبع نواب ادھر کو آئی ہے

دل خوش احبابِ شاد پھر ہے دہر — بستہ آئیں دو راستہ ہے شہر

نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں — عیش و عشرت کے محو خرد و کلاں

ہر طرف شہر میں ہے آرائش — رہرواں کی نہیں ہے گنجائش

شیشہ بازِ فلک ہے آتش باز — کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز

ماہ سے ماہتاب کی ہے طرح — کس سے ہو لطفِ روشنی کی شرح

نہیں رستوں میں روشنی کے دیے — نجم ہے چشم روشنی کے لیے

کیا ستاروں کا چھوٹنا کہیے — آسماں کی طرف ہی تکتے رہیے

شبِ شادی کی دھوم کی کیا بات — روزِ روشن تھی روشنی سے رات

دو طرف چھوٹتے جو ہیں گے انار — راہ و رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب — سب مہیا ہیں عیش کے اسباب

لا وہ جوں آفتاب ساغرِ زر — آبِ گل رنگ سے لبالب کر

آج جھوما ہے ابرِ بخشش زور — کچھ نظر ہے تجھے ہوا کی اور

دستِ دستور ابرِ نیساں ہے | یعنے یک دست گوہر افشاں ہے
کر چمن زارِ دست و دل کی سیر | ہیں نہال آج آشنا و غیر
گل نمط دل شگفتہ سب کے کیے | خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیے
لا کہاں ہے وہ لالہ رنگ شراب | جس سے مستی گزارہ ہوں احباب
آو مطرب لیے رباب و چنگ | کاڑھو منہ سے نواے سیر آہنگ
ہر طرف رقص میں ہے گل رویاں | پاے کوباں ہیں سلسلہ مویاں
شادمانی سے ہو نوا پرواز | دے بہارِ گزشتہ کو آواز
گل و لالہ سے چشم باز کرے | رنگِ صحبت کو دیکھ ناز کرے
چھیڑ سازِ طرب نوا کے تئیں | باندھ آواز سے ہوا کے تئیں
وجد میں لا تو مے پرستوں کو | یاد دے ٹک سرود مستوں کو
آو ساقی کہ روشنی ہے خوب | محوِ آرایش آج ہیں محبوب
کاغذیں باغ کیا تماشا ہے | پھول کترا کہ گل تراشا ہے
ٹکّے سے مشعلوں کا ہوں بندا | نور کا ماہ نے کیا چندا
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار | صحبتِ عیش کو چھکا یک بار
لالہ رنگِ رُخِ نکویاں کو | مایۂ ناز خوب رویاں کو
اس پری کو نکال شیشے سے | رنگ مجلس میں ڈال شیشے سے
ہووے سرمست ہو تماشائی | حکم کش ہے سپہرِ مینائی
چھوڑ آئینِ برد باری کا | سیر کر لے تزک سواری کا
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے | ایک دم جام متصل دے لے

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم — جیسے ابرِ بہار آوے جھوم

آے دولت سرا سے ہو کے سوار — لعل ناب و گہر ہیں صرف نثار

اِک مہابت کے ساتھ فیل نشاں — آگے مانندِ کوہِ زر کے رواں

اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے — جیسے آویں جوان مدھ ماتے

جھول زربفت کی ہے ساری شب — رو کشِ انجمِ فلک ہیں سب

پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں — صفِ مژگاں ہو دلبروں کی جوں

بال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ — جن کے دیکھے کمیت چرخ ہے دنگ

خوش سواری و خوش جلو و خوش راہ — باگ اُچکے تو پھر نہ ٹھیرے نگاہ

گردنوں میں پڑے حمائلِ گل — ہیں جلو میں بہ صد شمائلِ گل

تھا بہت تیز گام اسپِ خیال — رہ گیا دیکھ کر انھوں کی چال

تھے پری زاد چھیڑے اڑ جاویں — آنکھ پھیرے تو کل سے مڑ جاویں

کسمسانے میں باو سے آگے — ہاں کہے جیسے وہم جا لاگے

نوبتی اب طبیعتوں کو رجھاو — چل سواری کا ٹک اصول بجاو

چوب نقارے پر لگا اس ڈھب — کہ رکھیں گوش اس صدا پہ سب

ایک دو دم بجاے جاو تو نہیں — دل کش آوازہ گاے جاو پہ نہیں

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل — رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل

وہ جو دیوے تو کیا لیا جاوے — خوشہ خوشہ گہر دیا جاوے

ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے — شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشن خوش انجام — دورِ گردوں بہ کامِ عیش مدام

آ مغنی! غزل سرائی کر کچھ مزے سے بھی آشنائی کر

پڑھ غزل میر کی جو ہووے یاد
ان کو تو اس میں کہتے ہیں اُستاد

غزل

موسم ابر ہو سبو بھی ہو — گل ہو گلشن ہو اور تو بھی ہو
کب تک آئینے کا یہ حسن قبول — منہ ترا اس طرف کبھو بھی ہو
گو تیرا سا رنگ گل کا ہے — دیکھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ہو
ہے غرض عشق صرف ہی لیکن — شرط یہ ہے کہ جستجو بھی ہو
سرکشی گل کی خوش نہیں آتی — ناز کرنے کو ویسا رُو بھی ہو
کس کو بلبل ہے دم کشی کا دماغ — ہو تو گل ہی کی گفتگو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پر میر
ہو تو اس کی ہی آرزو بھی ہو

۱۲

ہولی

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

جشن نوروزی اہلِ ہند سب
ہے یہی تب محوِ عشرت ہیں گے اب

شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں
صحنِ دولت خانہ رشکِ بوستاں

اس چمن سے باغ پر گل سرخ و زرد
نکہتِ گل جھاڑیں گے واں آ کے گرد

پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر
لالہ و صد برگ سب باغِ نظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جو اں
جیسے گل دستہ تھے جو وں پر رواں

زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس
عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس

رنگ افشانی سے پڑتی تھی بھہار
رنگِ باراں تھا مگر ابرِ بہار

مرغ گلشنِ گلرخاں کو جان پھول
بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول

قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
جس کے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال

برگِ گل طوان اڑاتے تھے عبیر
تھی ہوا میں گرد تا چرخِ اثیر

روشن الدولہ نے کی تھی روشنی
کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی

وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک
تھے تماشائی گدا و شاہ تک

راہ میں ترپولیے مینار تھے
روشنی کے کوچہ و بازار تھے

گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا
اس روش کی دھوم کا اودھم نہ تھا

اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یاں
دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں

ٹٹیاں دریا کی باندھیں دو طرف
کیا چراغاں آسماں کے ہو طرف

تھا جہاں تک آبِ دریا کا بہاو
واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاو

ایک عالم دیکھتا ہے دور سے
رات دن تھی روشنی کے نور سے

کوچہ و بازار بام و در بنے
روشنی کے دونوں رستے گھر بنے

سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں
پیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں

آئے کس کس رنگ سے دامن سوار
باو کے رنگوں جنھوں کا تھا گزار

ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے
جیسے مدہ ماتے جواں ہو انمنے

کیسی کیسی دیکھیں شکلیں نازیاں
سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں

اِن دیوں کے عکس سے دریا کا آب
آئینہ کے سطح کی رکھتا تھا آب

کشتیوں میں جو دیئے بھر کر چلے
پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے

منعکس تھے جو چراغاں تہ تلک
آب کی وسعت تھی بر نجمِ فلک

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں
ذو دنب جیسے ستارے ہوں عیاں

جا ہی جو ہی چھوڑنا ہے یاد بود
روشنانِ ذو ذوانب تھے نمود

گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ
دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہو باڑ

اس روش سے نھے ستارے چھوٹتے
ناگہاں جو ہوویں تارے ٹوٹتے

دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں
شعلے تھے لہروں کے پیچ و تاب میں

ہر دو جانب چن گئے ناری انار
گلفشانی سے انھوں کی تھی بہار

ماہتابی اک طرف سے جو دغی
چاند سا نکلا ہوئے حیراں سبھی

آفریں صناع لوگو! آفریں — کیا لگایا باغ آکر کاغذیں
گل کتر کر پھول گل ہی کر دیے — رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیے
متصل تو ہیں ستاروں کی دغلیں — لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں
دیکھیاں کیا کیا یہ شعلہ خیزیاں — تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں
نذر کو نواب کی اہلِ فرنگ — لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گل ریزی سے گلشن ہو گیا — چرخ اِن تاروں سے روشن ہو گیا
داغیاں تو ہیں ہوائی ایک بار — پھیلے تارے آسماں پر بے شمار
کیا ہوائی باؤ میں لہرا گئی — تارے سانپوں کے سے سن پھیلا گئی
کیا ہی آتش دستیاں دے کر گئے — شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے
رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے — تہ بساطِ آب دریا آگ ہے
لکھ غزل اب میر رنگیں تر کوئی — سُن کے ہو محظوظ جس کو ہر کوئی

غزل

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے — اٹھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو ادھر کہیں سے
بالیدگی سے پہنچے گل آدمی کے سر تک — ہو واں تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے
خوش رنگ تر ہے بلبل رخسار سے پری کے — صد برگ واں طرف ہے خورشید کی جبیں سے
منھ پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں — کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہووے — اس قطعۂ چمن کے محبوب خوش نشیں سے
یک سو گلال منھ پر خوباں کے مل رہے ہیں — الجھے ہے ہاتھ یکسو گیسوئے نازنیں سے
جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا — تب خوف کیجیے کیا پیشانیوں کے چیں سے

۱۳

ساقی نامۂ ہولی

آؤ ساقی شراب نوش کریں
شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

آؤ ساقی بہار پھر آئی
ہولی میں کتنی شادیاں لائیں

شادیاں بے شگوں سراسر ہیں
کوچے سو شہر کے برابر ہیں

دست دستور ہے جو زر افشاں
پھر جہانِ کہن ہوا ہے جواں

دونو رستے عمارت خوش ہے
تازہ کاری شہر دل کش ہے

اور بازاری رنگ لائے ہیں
سارے رنگیں ستھوں لگائے ہیں

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے
شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشم بد دور! ایسی بستی سے
یہی مقصد ہے ملک ہستی سے

لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ادھر ہے

آئیں بستہ ہوا ہے سارا شہر
کاغذی گل سے گلستاں ہے دہر

ایسے گل پھول ہیں جو صرفِ کار
راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر
جن میں ہستی متاع لعل و گہر

میوۂ نورس و رسیدہ بہت
گلِ خوش رنگ بوئے چیدہ بہت

شبِ شادی کو لڑکے ہوں جو سوا
ہیں صغیر و کبیر بہرِ نثار

تختِ بہرِ زنانِ رقص کناں
چنے رستے ہیں بے چنیں و چناں

گلِ کاغذ سے شہر ہے گلزار
تو کہے آئی ہے بہار اے یار

ساقیا عیش کا ہو بزم آرا — سارے لوگوں میں جام مے کو پھرا
جس میں تہ پاوے اس پری کو دے — ورنہ شیشے کی شیشے میں رکھ لے
ہو گی مجلس جو مستِ آسایش — کون دیکھے گا لطف آرایش
آؤ ساقی قرار ہے باہم — کہ تماشا کناں پھریں خُرّم
زنِ رقّاص پر نگاہ کریں — کسو سادہ سے چل کے راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ — کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ
کسو خوشرو کے منہ پہ منہ رکھ لیں — کنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں
خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی — کسو نازک بدن سے ہم دوشی
کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست — جائیں گے تھوڑی دور دست بدست
مچلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ — پھر منیں گے کسو کے رو کو دیکھ
اب گلابی پئیں گے بھر بھر ہم — باقی ساقی پئیں گے پھر کر ہم
کہیں آرایش آکے دیکھیں گے — کاغذیں باغ جا کے دیکھیں گے
کسو جھوش سے ہوویں گے گل باز — کھینچیں گے اک دو دم اس کے ناز
آؤ ساقی مے دو آتشہ دے — اسی مے کا بغل میں شیشہ لے
گرم ہو جو دماغ انساں کا — لطف آوے نظر چراغاں کا
جس طرف دیکھیے چراغاں ہے — شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے
باغ سے روشنی ہوئی ہے زیاد — ہے یہ ہنگامہ تا جلال آباد
شمع و فانوس کا بہت ہے ہجوم — شمع رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم
لوٹیے ان گلوں کی اب تو بہار — گو کسو کے گلے کا ہو جیسے ہار

اب تو اودھم ہی مچ گیا ہر سو | دارو پی کر پھریں چلیں ہم تو
تارے سے ہیں چراغ چار طرف | آسماں پر زمیں رکھے ہے شرف
غنچہ غنچہ دیوں کو دیکھیں جہاں | کسو نو گل سے رکھیں صحبتِ واں
کہیں نوبت کو چل کے سنیے گا | نَے کے بجنے پہ سر کو دھنیے گا
نوبتی خوش سلیقہ سارے ہیں | نَے نوازوں نے جان مارے ہیں
آج نوبت کے بجنے پر ہے رنگ | عقل ہوتی ہے سن ٹکورے دنگ
جھانجھ کے سننے کی رہی ہے جھانجھ | صبح جوں توں کے ہم کریں ہیں سانجھ
بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی | پھریے سرخوشی سے تا بہ کے ساقی
شیشہ شیشہ شراب اب پیجے | بلکہ خم منہ لگا کے سب پیجے
سیر کرنے کنارِ نہر و گشت | لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت
انھیں پھولوں کے انعکاس سے آب | تو کہے لالہ رنگ سب ہے شراب
سبزۂ گل ہوئی ہے ہر کیاری | ایک ہی گل زمیں زمیں ساری
درمیاں یک شجر نہیں بد برگ | ہے ہزارا کہ لالۂ صد برگ
جوشِ لالہ سے تا النج و سنگ | شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ
تختہ کیونکر نہ ہو دماغِ خاک | دشت در دشت ہے گل تریاک
پھر لبالب ہیں آب گیر رنگ | اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پاس آتے ہیں مرغ گلشن بھول | تھے وے دل بر گلاب کے سے پھول
زعفرانی لباس تھے سب کے | رسمسے آئے صبح کو شب کے
پگڑیاں جامہ بھیگے سو سو ہیں | ان کو گل ہائے تر کہیں تو ہیں

چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ
سیکڑوں پھولوں کی چھڑی سے ساتھ

قمقمے بھر گلال جو مارے
مہوشاں لالہ رُخ ہوے سارے

خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں
گل کی پتّی ملا اڑاتے ہیں

جشن نوروزِ ہند، ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

عشق ہے اے گروہ آتش زن
دونوں رستے چراغ ہیں روشن

ٹھاٹھ کیا روشنی کے باندھ دیے
شہر میں نام روشن اپنے کیے

دور دو تھے خیال و سوانگ آے
گھڑے دامن سوار کیا لاے

روشنی وار سے ہے پار تلک
گل کا کاغذ ہے فرق خار تلک

درِ دولت سے لے کے تا سرِ آب
ہے چراغ اور شمع ہی کی تاب

پھر سرِ پل سے تا عمارتِ نو
جلتے ہیں مجتمع دیے سو سو

ہاتھی رنگے گئے پڑی ہے دھوم
جیسے ابرِ سیاہ آے جھوم

خیمہ استادہ کر چکے شب باز
پتلیوں نے کیا خرامِ ناز

یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب
شاہ و دستور حکم و کارِ ادب

آے شکلیں بنا کے صورت باز
ڈوم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز

نقل معقول کی سو حاجی بنے
سج کے عمامے سر پہ کتنے جنے

کوئی جوگی، کوئی فقیر بنا
کوئی ڈاڑھی لگا کے پیر بنا

کوئی بنیا بنا، کوئی اوباش
نقل کرنی تھی ان سبھوں کی معاش

کوئی شاعر بنا، نہ جس کی نظیر
یعنے مستغرقِ خیال تھا میر

کچھ سپاہی بنے تھے، کچھ تجار
کوئی زاہد بنا، کوئی خمار

جس کی تقلید کی سو ویسی طرح
اصل ہوتی نہیں ہے ایسی طرح

کر کے سعی و تلاش چاروں دانگ
خوب دیکھا تو ہے یہ عالم سوانگ

آ و ساقی نہ رکھ خراب احوال
دیجے جا جام بادہ مالا مال

چُل سواری کا سیر بھی ہے بڑا
ایک عالم ہے دونوں رستے کھڑا

جُلِ زربفت پوش فیل نشاں
کوہ زر سا ہے پیش پیش رواں

کدخدا ہونے کو چلا دولھا
بال و گوپالِ عظم سے جوں شہ

گل کی پا کھڑی ہوئی یک بار
ہاتھی آیا بہ رنگ ابر بہار

زری پوشوں کا پیش و پس انبوہ
اللہ اللہ رے ان کی شان و شکوہ

قوز میں کتنے سونے کے سے پہاڑ
آگے روپے کی روشنی کے جھاڑ

موتی کرتے تھے ہر طرف سے نثار
تھا مگر فیل ابر گوہر بار

ہیں جلو میں زمینیاں حاضر
جاہ کے آسمانیاں ناظر

عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سمیت
شاعراں مدح خواں ہیں میر سمیت

تازی ترکی عراقی و عربی
کوتل آگے تھے خوش جلو میں سبھی

رہیں رکھ لو جہاں کہ منھ کے زم
چھیڑے بادِ سموم سے ہوں گرم

آ و ساقی پلا شراب ہمیں
روشنی کی نہیں ہے تاب ہمیں

روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ
سیر میں گرم ہو گیا جامہ

گرمی میں مشعلوں کی آئے تنگ
دودِ مشعل سے جامے کا ہے رنگ

دو طرف سیم بندی کر دی ہے
سونے روپے سے راہ بھر دی ہے

شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن
زور پھولا ہے کاغذی گلشن

واہ آتش زنان آتشِ دست — دار و بیگر پھرو ہو کیسے مست
تو ہیں کیا ڈھالیں ہیں ستاروں کی — کھوئی رونق فلک کے تاروں کی
تارے موقوف کچھ سما پہ نہیں — تو ہیں چھوٹیں مگر ہوا پہ نہیں
ماہ بھی چشم روشنی کے لیے — ہے چراغاں ستارگاں سے کیے
گنج چھوٹے ہیں یا کہ باڑ جھڑی — یا ہوائی ہے جگنوؤں کی چھڑی
گل فشاں ہیں پڑیں جو پھل جھڑیاں — کھینتیاں ہیں دلوں کی گل جھڑیاں
چھوٹتے ہیں انار و مہتابی — رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی
باو سے دو دیے ہوئے گر ماند — دغیں مہتابیاں کہ نکلے چاند
آؤ اے مطربانِ سیر آہنگ — ساتھ اپنے لیے رباب و چنگ
ہو غزل خوانِ بزمِ عیش و طرب — پر نہ کریو خیالِ ترکِ ادب
منعقد مجلسِ شہانہ ہے — آدبِ آصفِ زمانہ ہے
آؤ ساقی مجھے قرابہ دے — دربغل شیشہ ساتھ اپنے لے
بحرِ بخشش کی لہریں اب آئیں — زر و گوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ — دیتے ہیں خلعتِ گراں مایہ
طرہ ہائے زری و بادلہ تاش — تختہ ہائے دوشالہ تحفہ لباس
بہت ان میں سیئے بہت نہ سیئے — ایک دم میں سبھوں کو بخش دیئے
خاص ملبوس نوع نوع تمام — لے گئے شاد ہو کے مردم عام
کیا بچھا ہے فراخ دستر خواں — جس پہ ہے خلق یک جہاں مہماں
تورہ بندی ہوئی تکلف سے — کھانے نکلے نئے تصرف سے

لطف کے ساتھ نعمتوں کا وفور — زیر ہر جعبہ قاب ہے پرنور
عام تھا ان لطافتوں سے طعام — دیتے لیتے تھے ہر سحر ہر شام
کس کو اسباب یہ میسر ہیں — ظرف سیمیں جعبۂ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا — حرص دونوں کی سیر ہے یک جا
عمر و دولت ہو اس کی حد سے زیادہ — ہے اسی سے جہاں نشاط آباد

آؤ ساقی غزل سرا بھی ہو
لذت شعر سے مزا بھی ہو

غزل

اب کے بہار کیا کیا دریا پہ رنگ لائی — اک شہر نکلے لالہ پھر اس میں ہولی آئی
کی فکر سال تاریخ آواز غیب آئی — "ہم نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کی خدائی"
آنکھوں کی روشنی بھی اپنی ہوئی دوچندان — طالع نے چاندنی میں کیا روشنی دکھائی
ہو یا و جس طرف کی آنکھیں ادھر ہیں اس کی — نرگس کا اس ہوا میں دیدہ بھی ہے ہوائی
بے گل رہے نہ یک دم بلبل کے آہ و نالے — محبوب سے کسو کو یارب نہ ہو جدائی
گل تک ہنسا نہ مجھ سے بلبل نہ بولی ہرگز — کس کس کی بے دماغی بے یار میں اٹھائی
ہم بھی رہے ہوا وہ جب تک جوان جاہل — کی عمر رفتنی نے بارے نہ بے وفائی
انواں زمانے کے تو کیا جانیں دل لگی کو — لگتی ہے جس کے دل کو وہ جانتا ہی بھائی
ہے دامگاہ دنیا ہر جا فریب اس میں — دیتی نہیں دکھائی اپنی مجھے رہائی

گزری جو کچھ سو گزری یاری میں دلبروں کی
میر اب کسو سے تم تو کریو نہ آشنائی

سنہ ۱۲۱۷ھ

(۱۴)

ساقی نامہ

ہے قابل حمد وہ سر انداز
جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز

اس کے ہی حسن نے چھکایا
ہستی کا نشہ اسی سے پایا

پی اُن نے شراب خود پرستی
طاری ہوی اس پہ زورِ مستی

وہ مست شراب ناز ہے فرد
خورشید ہے اس کا جام پروردہ

ہے گردشِ چشم اُس سے افسوں
پھر جاے ہے جس کے ساتھ گردوں

ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول
آخر ہے وہی وہی ہے اول

عالم ہے قرابۂ مئے خام
ہے دور سپہر گردشِ جام

مشہور جہاں جو کیفؔ کم ہے
بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے

وہ مستِ نیاز ہے حرم میں
وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں

ہے آبِ رخِ زمانہ اس سے
روشن ہے تمام خانہ اس سے

مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے
صہبا میں جو دل خوشی ہے وہ ہے

شمشاد ہے سرفراز اس سے
گل دیدۂ نیم باز اس سے

خوگر اسے نازپیشگی ہے
وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے

جو عکس پڑا ہے جامِ مے میں
آتی ہے صدا اسی کی نے میں

ہے جلوہ گری میں یاں بصد ناز
وہ مست گزارہ و سر انداز

سو رنگ ہیں اس کے یاد رکھ تو | ہر جلوے سے دل کو شاد رکھ تو
عالم میں جو کچھ نمود میں ہے | ہر لحظہ اُسے سجود میں ہے
کر یاد اسی کو اور مے پی | جیتا رہے کوئی دن تو خوش جی
اب روئے سخن چمن کو کریے | مینائے دل اور مے سے بھریے
آئی ہے بہار مے گساراں | پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں
آئی ہے بہار و ہر خیاباں | ہے لطف ہوا سے گل بہ داماں
آئی ہے بہار زہد کیشاں | ہے توبۂ بادہ، دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغِ گلزار | کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ | مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی | معذور رکھ، اب بہار آئی
گل بادِ صبا کے تا کمر ہے | دامانِ بلند ابر تر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں | تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مئے ناب دے ہوا ہے | ایک جرعہ شراب دے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شورِ فصلِ دے کا | ٹپکے ہے ہوا سے رنگ مے کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ | ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابرِ جوشاں | آبِ رخ کار سبز پوشاں
تحریکِ نسیم دم بہ دم ہے | تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی | اٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا | رنگِ گل و لالہ زور چمکا

ہے گل کی ہوا سبو کشی میں | بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شوخ جام در دست | نرگس ہے کسو کی نرگسِ مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی | جھومے ہیں نہال جوں شرابی
ہے سرو جواں نشہ در سر | لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا | یعنے کہ ہے دور اب سبو کا
ساقی قدحے کہ ذوقِ مُل ہے | مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے

غزل

شب وہ جو پیے شراب نکلا | جانا یہ کہ آفتاب نکلا
قربان پیالۂ مےُ ناب | جس سے کہ ترا حجاب نکلا
تجھ بن جو پیا تھا قطرہ مے کا | آنکھوں سے ہو خون ناب نکلا
مستی میں شراب کی جو دیکھا | عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدے میں آیا | پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جرعہ شراب ہی میں واعظ | ہر مسخرگی کا باب نکلا

تھا غیرتِ بادہ عکسِ گل سے
جس جوے چمن سے آب نکلا

ہو صرفِ شراب کاش ساقی | یہ شیشۂ عمر سے ہے جو باقی
بے ساغرِ مے خنک ہے جینا | رکھتا ہے شگوں شراب پینا
لا بادۂ کہنہ سال نو ہے | سجّادہ بھی بابت گرو ہے
دروازۂ مےکدہ کھلا ہے | ہر پیر و جواں کو الصلا ہے

اینڈے ہے ہر ایک مست جوں تاک — لیتے نہیں نام دامنِ پاک

ہر مغ بچہ جام زیرِ سر ہے — ہر گوشے میں عالمِ دگر ہے

مستیٔ نگاہ. عقل دشمن — خوبیٔ خرامِ. مرد افگن

کہتے گئے صاحب کرامات — ہم بھی نہیں قابلِ خرابات

جو لوگ کہ اس جگہ سے اٹھے — کب حلقہ و خانقاہ سے اٹھے

یاں پیتے ہیں جام بیخودی کا — ہے دور تمام بیخودی کا

مستی سے ہر ایک صبح صد بار — خورشید کا سر ہے اور دیوار

ہیں قابلِ سیر خرقہ پوشاں — دریا دلیٔ شراب نوشاں

ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں — کشتی ہے نشہ و گدا کی کف میں

ہر کوچے میں رہتی تھی منادی — تا رسمِ خرد وری اٹھادی

از خود شدن اک مقام ہے گا — وہ مرتبہ یاں مدام ہے گا

گو پُر ہے یہ دور پر کہاں تک — اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک

بے خود ہو کر حجاب اٹھے — دل یاں سے کہیں شتاب اٹھے

پہنچیں ہیں فنا کو بیخودی سے — پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے

پی جرعہ و ہوش کو دعا کہہ — ہر بادہ فروش کو دعا کہہ

جوشش میں ہے بادۂ کہن سال — عبرت ہو جسے خوش اس کا احوال

اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقت وداعِ ہوش آیا

کھینچوں ہیں کہاں تلک دمِ سرد — ساقی وہ شراب شعلہ پرورد

وہ داروے دردِ ناصبوراں — وہ مائۂ نورِ چشم کوراں

سرمایۂ عمرِ جاودانی یعنے وہ ہے آبِ زندگانی
وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے وہ عیش دلِ گزیدہ بارے
آئینۂ حسنِ خود پسنداں زینت دہِ عنبریں کمنداں
وہ رنگِ رُخِ بہار یعنے وہ بادۂ خوش گوار یعنے
یاقوتِ گداز دادۂ عشق یعنے وہ ہے جام بادۂ عشق
وہ لطفِ ہوا وہ سیرِ مہتاب وہ شعلۂ غوطہ خوردہ در آب
وہ کام دلِ سبو بدوشاں یعنی کہ وہ شرابِ جوشاں
وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے وہ داروے بہشتی کہاں ہے
وہ جس کی طرف کو ہے تہِ دل یعنے وہ ہے ماہ شیشہ منزل
وہ آتشِ تیز آب آمیز وہ عربدہ جو، وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جانِ ناامیداں وہ رو سیہیٔ روسفیداں
وہ رونقِ کارگاہِ شیشہ وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہے توبہ مو پریشاں وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے جل جاے ثابت قدموں کا پاؤں چل جاے
وہ سرخیٔ چشمِ خوب رویاں اسبابِ خرابیٔ نکویاں
وہ دلبرِ خود سر و شر آئیں وہ رہزنِ راہِ دین و آئیں
وہ جس سے غبار دل سے دھو لوں مینا کے گلے سے لگ کے رو لوں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
لا اس کو جو آستین جھاڑوں پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں

بیہوش شراب ناب رہیے
یوں تا بکجا کباب رہیے

ہے مستی بیخودی ضروری
کھل جاوے مقام بے شعوری

دل غم سے بھرا ہے زور میرا
تا عرش گیا ہے شور میرا

ہے دل میں کہ گل کی آرزو ہو
شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو

ہر گام پہ لغزشِ قدم ہو
تکلیفِ شراب دم بہ دم ہو

جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں
جب کاکلِ صبح ہو پریشاں

جب نکلے ستارۂ سحر گہ
کر نعرۂ الصبوح یک رہ

ہے ذوقِ شراب صبح گاہی
بے لطف نہیں ہے روسیاہی

جب نشہ کی ترنگ آوے
مستی مجھے باغ میں لٹا دے

شیشہ مرے منھ کو تو لگا دے
کر ایسی نگاہ جو چھکا دے

جب بیخودی تمام آوے
سر پر مرے ہوش رو کے جاوے

رخصت ہے تجھے کہ میں نہ ہونگا
بے ہوش و خرد ہی پھر رہوں گا

بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا
ہو ورنہ قبول عذر میرا

مقولہ شاعر

کیا پیر شراب تو نے پی ہے
بیہودہ یہ گفتگو جو کی ہے

یا آب سیہ ترے قلم نے
یہ تجھ سے عجب کیا ہے ہم نے

تو کا ہے کو اتنا ہرزہ گو تھا
کب در گرو شراب تو تھا

بس مے سے زبان اب نہ تر کر
مستیِ سخن پہ ٹک نظر کر

ہے نشۂ سامعہ دوبالا
پھر حرف نہ جاوے گا سنبھالا

(۱۵)

جھُوٹ

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے

اے جھوٹ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہلِ دلق کا

اے جھوٹ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے

اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ہو گیا رواج
تیری متاع آب ہے ہر چارسو میں آج

اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیرِ سر ہے تو
اے جھوٹ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو

اے جھوٹ کب ہے عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

اے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مر جائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں نہ کبھی

کہنے سے آج ان کے کوئی دل نہ شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کئے پہروں کے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے

اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو نہ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسنِ ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا

پایان کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

اے جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ رہا سدا

کس جانکنی سے کوہ کنی کوہ کن نے کی
تصویر کھود شیریں کی پیشِ نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح شام غنچۂ مقصودِ دل کھلے

دلّالہ کہے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشقِ دل خستہ مر گیا

اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اٹھا کیے
ہنگامہ و فساد ہی ہر سو رہا کیے

اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہے ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹ اس طرح میں بہت جی سے جا چکے
وعدوں میں آہ لوگوں کے ڈسنے ہی آ چکے

اے جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سردار جس سے سب متعلق ہے کار و بار
سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدارِ کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

جھوٹا سوارِ دولت ابھی کا ہے یہ امیر
ورنہ قسم کسو کی بھی تھی حرفِ بار گیر

مشکل حصول کام ہے یاں حاصلِ کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

اک فرد دستخطی تھی مری ایک شخص پاس
دیکھا جو خوب اس کو تو مطلق نہیں ہے پاس

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور
اتنے لیے کہ رتبۂ عزت مرا ہے دور

آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ
حرکت نہ ہووے مجھ سے کوئی بغیر ضابطہ

مرزائی مجھ سے کھنچتی نہیں ہر عزیز کی
پھر شعر و شاعری بھی نہیں ہے تمیز کی

صحبت خدا ہی جانے پڑے کیسی اتفاق
کیا بات آوے بیچ میں بے ربطگی ہے شاق

میں مضطرب گھر اس کے گیا اٹھ کے پانچ بار
کہنے لگا زباں سے یہ ہوتے ہی وہ دوچار

تقصیر میری اس میں نہ کریگا کچھ خیال
صاحب کہیں خموشی کروں میں تو کیا مجال

لیکن یہ حرف اس بھی سیہ رو کا رکھیے یاد
انداز سے یہ لوگ سخن کرتے ہیں زیاد

بہتیری ایسی فردیں یہ رکھتے ہیں جیب میں ‎ رکھتے ہیں یونہیں لوگوں کو برسوں فریب میں

دکھلاؤں گا چلا ہوں سوال آپ کا لیے ‎ میں نے کہا فقیر کہو کس طرح جیے

بولا نہ ہوگا سعی میں ادھر سے کچھ قصور ‎ پھر دیکھیے کہ پردے سے ہوتا ہے کیا ظہور

اک آدھ ایسی بات بنا کر کھسک گیا ‎ دل اس خبر کے سننے سے میرا دھڑک گیا

یہ عرضیاں حضور کو بھیجیں ہیں صبح شام ‎ دستخط جو ہو کے آئے کوئی سو اسی کے نام

یعنی وہ اب کی آن کے دیوے گا کچھ شتاب ‎ دل جمع رکھیں کاہے کو کرتے ہیں اضطراب

دو چار بار آیا بھی وہ پر نہ کچھ ہوا ‎ مجھ کو جو اضطرار تھا میں بے اجل موا

مدت مدید گزری مجھے کرتے انتظار ‎ خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار

اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں ‎ تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں

آیا جو وہ لطیفۂ غیبی اب اپنے گھر ‎ میں مضطرب ہو آپ گیا ملنے اس کے گھر

بارے نہ اتفاق ہوا یہ کہ ہو ملاپ ‎ کھویا تھا اضطرار سے عز و وقار آپ

گھر آکے ایک بھائی کو بھیجا پیام دے ‎ آئے وے اس کے پاس سے جو کچھ جواب نے

حضرت سے کہیو پہلے بہت بندگی مری ‎ پھر کہیو اب ترقی ہے شرمندگی مری

دو چار دن میں بھیجے گا کچھ گھر ہی آکے ‎ در پے نہ اتنے ہو جیے میرے ملاپ کے

تب سے وے بھائی جاتے ہیں ہر روز صبح شام ‎ اب تک تو ملتوی ہے زمانہ زدے کا کام

دن دیکھتے ہیں وعدے کے بھی ہیں بہت قریب ‎ پھر ترک شہر کیجیے گا کہہ کے یا نصیب

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

(١٦)

دنیا

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل
کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

کہو گے کہ آگے تھا کہٹا کوئی
نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی

بجا ہی کیا کوس رحلت مدام
کنھوں نے نہ جیتا سنا یاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
یہاں جملہ ہے ایک بزمِ رواں

جسے دیکھو چلنے کا گرمِ تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود و باش

گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
نہ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی
وہ رنگینیٔ باغ کیا ہو گئی

ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر
پریشاں ہوئے مرغ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا

گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ
رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ

رہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی
رکن ہے جہاں باد کی لاگ تھی

نہ جدول رہے گی نہ سروِ رواں
گلستاں کہاویں گے ہو کا مکاں

زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاو
لپٹ جائیں گے آسماں جیسے تاو

سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب
چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جاے باش اور جا ہے عجب

بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں
عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں

جوانی گئی، موسمِ شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

ہنسوں کیونکہ ہنستی ہیں دنداں نما
کہ ہے جاے دنداں ہی دنداں نما

گیا شور سر سے جھکا ہے بہت
گئی واشد اب، دل رکا ہے بہت

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں، ہو چکی صبح شام

کریں لمس کیا ہر گھڑی ہے صداع
نہیں لذت اکل و شرب و وقاع

بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے
ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے

ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوے شعر کیا کیا فراموش ہاے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہاے

نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے
سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے

نہیں گور کے کام سے کچھ فراغ
کسے ذوقِ صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یونہی عینک نظر چڑھ گئی
بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر
کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھ منھ حرف زن ہو حریف
رہا سننے کے گوں نہ سمعِ شریف

صد افسوس لطفِ سماعت نہیں
صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا
جھکا سر جو زانو کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی
سفیدی مو سے سحر ہو گئی

بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار — کرے کون خوباں سے بوس و کنار

جو یہ حال ہی جا رہے ہیں ہم اب — دموں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق — جنئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے — تو دیکھو گے ہم پال سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم — یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم

کہے میں نہیں اپنے تک پا و دست — کیا خاک میں مجھ کو پیری نے پست

جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں — اگر منھ کو دیکھو تو وہ رو نہیں

بدن کی ہوئی میری صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور

جسد ناتواں جائے مہمان تنگ — سخن منھ پہ آوے وداعی کے رنگ

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ — در و بام پر حسرتوں سے نگاہ

شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی

برودت بہت جسم میں آگئی — مزاجی تھی گرمی سو ٹھٹھر اگئی

چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش — کہ ہوتا رہے روح کو انتعاش

وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے — پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

(۱۷)

سرگذشتِ سفر

یاو توفیق ٹک تو سر کو دھنو
یہ بھی اک سانحہ ہے میرؔ سنو

ہم کو درپیش تب سفر آیا
جب کہ برسات سر ہی پر آیا

ابر ہونے لگے سپید و سیاہ
پانی رستوں میں، کیچ ساری راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
منھ اُٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو تو کمل، نہ پٹو، نہ لوئی
سایہ گستر نہ ابر بن کوئی

ابر ہی بیکسی پہ روتا تھا
ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا

کیچ پانی میں کپڑے خوار ہوئے
وو ہیں گاڑی میں جا سوار ہوئے

رہ روی کا کیا جو ہم نے میل
بھینس چہلے کے تھے بہل کے بیل

آسماں آب سب، زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسے زندگی کے بیچ

سب کی دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کے سطح پر نگاہ پڑی

لجیے لطمے کا کیا کہوں میں اوج
باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

دامنِ ابر پاٹ دریا کا
دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا

ہوش جاتا تھا دیکھ جوشِ آب
گوش کرتا تھا کر خروشِ آب

آب تہ دار اور تیرہ بہت
لہر اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفاں — دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جاں

ہمرہِ آب سیکڑوں گرداب — ساتھ تھی صدتری کے چشمِ حباب

ناو میں پاؤں ہم نے بارے رکھا — خوف کو جان سے کنارے رکھا

جزر و مد سب جو اس کھوتا تھا — خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

جب کہ کشتی رواں ہوئی واں سے — جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

موج اٹھنے لگی جو طوفاں زا — لجہ آیا نظر سو عمّاں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم — ناخدائی خدا نے کی اس دم

بلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ — عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا — خوف سے جی ہی ڈوب جاتا تھا

خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق — بیخودی سے ہوا تھا استغراق

بہتے پھرتے تھے خضر کشتی پاس — غوطے کھاتے تھے حضرت الیاس

بد بلا سے تھے ہم کنار ہوئے — تھا خدا ہی جو بلّی پار ہوئے

کسو درویش کا تھا یمن قدم — جا کے پہنچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا — گوہرِ جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اس کنارے کا جو اثر پایا — ہم تلاطم کشوں میں جی آیا

اس طرف اترے آب کے جا کر — میر اور پیر، صاحب و چاکر

شکر لب پر دلوں سے محو گلا — کسو و ناکس سبھوں سے خضر ملا

پار کا گنج تھا جو شاہ درا — سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا

فاصلہ ایک کوس کا تھا بیچ — راہ یاں سے تھی واں تلک سب کیچ

تھے بہت بیچ میں نشیب و فراز
پہنچے واں شام کھینچ رنج دراز

سو نہ جاگہ تھی، نہ مکان مبیت
چار دو کانیں ایک چھوٹی مسیت

جا کے حیراں ہوئے کدھر جاویں
سر گھسیڑیں جو ٹک جگہ پاویں

تک و دو ہر طرف لگے کرنے
تس پہ پڑتے تھے مینھ کے بھرنے

کوئی میداں میں، کوئی چھپر میں
کوئی در میں کوئی کسو گھر میں

گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ
جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ

بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو
کون پوچھے نفر مصاحب کو

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سرا پائی
ویسے گھر چھوٹے، ویسی جا پائی

رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان
جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان

کچھ پکانے کا جب سوال کیا
میں نے اظہار اپنا حال کیا

یاں جو لائے ہیں مجھ کو اپنے ساتھ
زندگانی مری ہے ان کے ہاتھ

پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام
صبح کا صبح، مجھ کو شام کا شام

اور پکوائیے تو زاید ہو
خامے سے اپنے اور عاید ہو

جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے
کچھ رہا سو اُٹھا دیا میں نے

سن کے اک دل سے کھینچی اُن نے آہ
اور بولی کہ واہ صاحب واہ

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے
چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے

کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے
ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم
ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات
دیکھیے کس طرح سے گزرے رات

صدقے ہیں ایسے بھی اُتارے کے
سو گئے بخت گھر ہمارے کے

میں کہا مہترانی جی کچھ لو
مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو

بعضے کھاتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں
بعضے مجھ سی بھی آتے جاتے ہیں

بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام
صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام

یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ
غازی آباد کو گئے سب پوچ

راہ طے کر سرا میں جا اترے
کچھ ستم دیدہ پاس آ اُترے

صاحب اُترے حویلی میں آکر
باغ میں اُس کے سب نفر چاکر

بارور تھے درخت و سایہ بھی
پھل و لیکن کنھوں نے پایا بھی

اس بھی منزل میں ایک روز رہے
گزری جس طور، کوئی کس سے کہے

لوگ جس دم سوار ہونے لگے
اور اسباب بار ہونے لگے

سوہنی اُس رواروی میں گئی
لوگ تھے مضطرب، جگہ تھی نئی

وحشت اس کو زبس کہ طاری ہوئی
سر پٹک کر کسو طرف کو موئی

ایدھر اودھر تلاش کر دیکھا
گم شدہ کو نہ پھر نظر دیکھا

ساری بستی میں جست و جو کو گیا
دیر تک یہ خیال سب کو رہا

جن کے آتی ہے، ایسے جاتے ہیں
کہ نہ پھر کھوج ان کا پاتے ہیں

مرگ تھی اس کی اس جگہ تقدیر
بلی تھی یا کہ گربۂ تصویر

رنگ جیسے کہ وقت گرگ و میش
یعنی سرخی تھی کم، سیاہی بیش

جن سے مالوف تھی وہیں رہتی
ان سے کچھ کچھ نگاہوں میں کہتی

کیا نفاست مزاج کی کہیے
ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیے

خال جوں پھول گل کترتے ہیں — یا کہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں
چوہے چڑیا یہ اُن نے کب کی نظر — حج کا کرنا نہ فرض تھا اُس پر
موہنی بھی تو تھی بہن اس کی — نسبت اس کی تھی وہ بہت گھسکی
یاد ہے جو کچھ سو مار کھاوے یہ — ایک کیا چار چار کھاوے یہ
جانور مارنا تو ہے یک سو — تیز پنجہ کیا نہ اُن نے کبھو
یہ نزاکت اسی کو بن آوے — موش دشتی کو دیکھ ڈر جاوے
ان نے مارے ہیں ایسی کتنی ڈھونس — گھونس دیکھے تو ہووے کونے گھونس
یہ چھچھوندر کے بولتے بھاگے — وہ پڑی سوتی بھی ہو تو جاگے
چھپکلی سے یہ پھیر منھ کو لے — وہ جفا کار جیفہ پر جی دے
یہ پری سی نہ تھی جو خرام کرے — وہ جو اچھلے تو دھوم دھام کرے
کبک اس کی خرام کے عاشق — جانور اس کے نام کے عاشق
غرض افسوس کی جگہ بلّی — اب کہاں گو کہ چھانیے دلّی
ایسی بیگم مزاج بلّی کھو — بیگم آباد ہم گئے یارو
واں سے میرٹھ سبھوں نے کی منزل — کیچ پانی اگرچہ تھا حایل
گرتے پڑتے پہنچ گئے سارے — ہم جفاے سپہر کے مارے
واں سے لاڈر سنگ پھر واں سے — جا کے واں تنگ آ گئے جاں سے
اک گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی
چھوٹی پھاٹی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا — ہر قدم ایک غار و چقر تھا

کھنڈر سے اس میں تین چار مکاں
وہ گڑھی ساری کھتّے ناج کے تھے
خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا
خشتی پاٹے اگر نہ بندھواتے
باو جنگل کی تند کچھ نہ رکاو
اک گڑھی جس کی سیکڑوں راہیں
وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ
ورنہ مشکل بہت ثبات قدم
باؤ سے دن کو سائیں سائیں کرے
گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار
ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب
کارپردازوں کو تقیّد ہے
وے بچارے بہانے کرتے ہیں
کہیے ان سے تو یہ ملے ہے جواب
ہم کو کھانے ہی کا تردّد ہے
بنیا منھ کو چھپائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل
سوچیں ہیں جب تو بھول جاتے ہیں
تم کو دیوار پاکھے ہیں گے یاد

جن کا گرنے پہ سخت ہے میلاں
برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے
بنگلا اک لا کے اس کے بیچ دھرا
باویں اس سمیت اڑ جاتے
مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاو
واں ٹھہرنے کو چاہیے باہیں
یا کوئی جوگی جو کرے واں جوگ
دل میں اک ہول ہی رہے ہر دم
رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے
بے زری سے بنانا ہے دشوار
پردہ کا ہے کا پھر ہے رفع حجاب
شور ہے گالی ہے تشدّد ہے
رات دن لوگ جھکی بھرتے ہیں
کس کے گھر سے بناویں لا کے شتاب
صبح بقّال کا تشدّد ہے
روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
ہم فقیروں کے رنگ ہیں سایل
بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں
ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد

کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں
دال آٹا جو تم کو پہنچاویں

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں
یاں بہم پہنچی ہے جگر ہو خوں

تم کہو آٹا کِرکرا کھایا
یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا

اور دو چار روز یہ بھی ہے
ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے

فصل ہونے ابھی نہیں پائی
پیشگی سب سے قرض لے کھائی

جس سے جھوٹے ہوے ہیں ہم دس بار
چوٹٹا وہ کہے ہے ساہوکار

ماش کی دال کا نہ کریے گِلا
گوشت یاں ہے کبھو کسو کو مِلا

چاہتے ہو تو مول لو اِک بُز
ورنہ بیٹھے رہو بنے خُبز

بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس
کھاو دال اور پاد دیے وسواس

جی اگر چاہے کوئی ترکاری
گول کدو ملے بہ صد خواری

بھنڈی بیگن کے ناؤں ٹھینڈسی تھا
اروی توری بغیر جی بس تھا

جز و کدو پادے کلّو بدّھو کیا
یعنے کچھ اور واں تھا کدو کیا

دار و گولی کے کچھ نہ تھے اسباب
ماش کی دال کھاتے تھے احباب

جو گرا ہی میں نہ چھوٹتے یوں گوز
بجتی رہتی تنبک کہاں سے روز

گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام
تس میں لسّاع جانور اقسام

جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس
کاٹ کھادیں تو اچھلو دو دو بانس

پشہ و لیک اور گتّی تھی
جن کے کاٹے اچھلتی پتّی تھی

ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے
شبگزوں سے بدن جلے جاتے

ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے
مرچ، جدوار پھر لگاتا ہے

ایک دو دن جلا فراغ ہوا
اس کی جاگہ سیاہ داغ ہوا

نہ کھجاتے کھجاتے سارے گھسے
چیتھے چیتھے ہوئے جو دانے پسے

دن کو وہ صورتِ طعام ہوئی
رات کو نیند یوں حرام ہوئی

کتّوں کے چاروں اور رہتے تھے
کتّے ہی واں کہیں تو بستے تھے

دو کہیں ہیں کھڑے کہیں بیٹھے
چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے

ایک نے پھوڑے باسن ایک کونے
کھود مارے گھروں کے سب کونے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے
خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے

سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک
شور عف عف سے آفت آئی ایک

گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے
روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے

ایک نے آکے دیگچہ چاٹا
ایک آیا سو کھا گیا آٹا

ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا
پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا

گھورنے اک لگا اندھیرا کر
ایک نے اور ایک پھیرا کر

گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے
ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے

لوگ سوتے ہیں، کتّے پھرتے ہیں
لڑتے ہیں، دوڑتے ہیں، گرتے ہیں

جبکہ ہڈی پہ چار چار لڑیں
گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں

ایک کے پیچھے ایک روز و شب
لینڈی سی واں نہ بندھ رہی تھی کب

کتّے ہی واں دو چار رہتے ہیں
دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں

جاگتے ہو تو دو بدو کتّے
سو کر اٹھو تو روبرو کتّے

سر پہ دربان کے بلا ہی رہے
کتا ایک آدھ گھر میں جا ہی رہے

منہ میں کف دور دور کرنے سے — حال بے حال شور کرنے سے
تو کہے سن کے وہ گلا پھاٹا — باولے کتّے نے اسے کاٹا
کتوں کی کیا سماجتوں کو کہیں — چیچڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر کہاں کہاں کتّے — بام و در چھت جہاں تہاں کتّے
جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی — رووے ہے اپنی جان کو کوئی
یک طرف سے چپڑ چپڑ کی صدا — یعنی کتّا ہے چکّی چاٹ رہا
ایک چھجنے کو منہ میں لے آیا — ایک چولھے کو کھودتا پایا
ایک کے منہ میں ہانڈی ہے کالی — ایک نے چھلنی چاٹ ہی ڈالی
تیل کی کپّی ایک لے بھاگا — ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا
کتّے یارو کہ جان کا تھا روگ — جاں بلب ہوں نہ کس طرح سے لوگ
آدمی کی معاش ہو کیوں کر — کتّوں میں بود و باش ہو کیوں کر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد — کہ بیابانِ سخت سے دے یاد
چار چھپّر کہیں چماروں کے — سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ — ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے — سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں — زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب نان
لوگ ایسے مکان سب ایسے — ایسی جاگہ سے اچٹیں دل کیسے
اور جو چار گھر نظر آئے — ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کولی چمار تھے کوئی — فاقوں کے زیر بار تھے کوئی

صورتیں کالی سوکھے سے   سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں   جان کھا جائیں کچھ نہ جیب تک لیں
اس سے آگے بڑھے تو دھنیوڑ تھے   اجڑے پچھڑے انھوں کے کچھ گھر تھے
اور آگے گئے تو تھا بازار   اس میں بنیوں کی تھی دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا   تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے   چھبڑوں میں خاک دھول ایک کنے
جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال   نام کو کہتے تھے اسے بقّال
اس کا عالم کیے یاں اٹھا مایا   اُن نے جیسا کیا تھا سو پایا
ایک کنجرے کے چار گٹھی پیاز   تس پہ اس کو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی   اس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی
ایک دوکان تھی پساری کی   ان نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی
اس سے جاکر جو مانگیے ہلدی   زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے   بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں   میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا   دیوے کچا وہی بتا دھنیا
ان میں دو دانے اور سب کنکر   دیوے کاغذ میں ہاتھ لپٹا کر
اونگنہ پورا نفر سے منگوایا   لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کریے قیاس   آگے جانا نہیں کہا مجھ پاس
اور دس بیس گھر گنواروں کے   اور دو چار فاقہ ماروں کے

پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں — یہی خانہ خطیب کا تھا واں

نہ تھی قید صلوٰۃ و رسمِ صوم — اس پہ سیّد امام واں کی قوم

بندے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی — اس طریقے سے آشنا نہ کوئی

راہ و رسم و طریق سب بے ڈھب — پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب

کوسوں بھاگا اگر ملا کوئی — صحبت ایسوں سے رکھے کیا کوئی

ایک تکیہ نہ جس میں فرشِ کاہ — حال درویش قابلِ صد آہ

ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اس کو — مرضِ جوع لاعلاج اس کو

برسوں چلّا کے نا اُمید ہوا — چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا

آتے جاتے سے اُن نے جو پایا — اسی پر رہ گیا وہی کھایا

گور دو چار خاک کے سے ڈھیر — جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر

اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم — پر کبھو بلی بھی نہ دیکھی ہم

کچھ نہ دیکھا ہم ان بھی گوروں سے — کام نکلا سو اپنے زوروں سے

کی توجہ جو ٹک دروں کی اُور — دل جگر پر مرے پڑا کچھ زور

جس سے چھاتی میں درد ہونے لگا — رنگ چہرے کا زرد ہونے لگا

پھر زمینداروں میں نفاق ہوا — یہ عجب اور اتفاق ہوا

دونوں کا اک جدا ہی مطلب ہے — یہ کہے روز، وہ کہے شب ہے

آس پاس اس گڑھی کے آئی جھیل — گم تھے برسات میں طریق و سبیل

ایدھر اودھر اتر کے پانی جاو — ٹھہرے پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاو

اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب — ہووے نزلہ زکام بے اسلوب

کتنے زوروں میں ہوتی ہے کھانسی — ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی
پھر وہ درجہ ہے جس میں ہووے دق — یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق
بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا — کیوں کہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا
اس میں آجاتے تو قیامت تھی — مال وجاں غرض سب کی رخصت تھی
نہ کوئی دادرس نہ وقتِ داد — مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد
کیا کڈھب چرخِ کج نے پھینکا تھا — پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی — اس بلا سے رہائی کی اپنی
بس قلم ہے صریرِ تیری تند — شور سے تو پڑا جہاں میں ڈند
بدزبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ — ایسی باتوں سے میں کیا ہے فراغ

ہو چکی صاحبوں کی فرمائش
چپ رہ اب ہے زمانِ آسائش

(۱۸)

خانۂ میرؔ

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے

کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ — کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم — تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام — چھت سے آنکھیں لگی رہی ہیں مدام

اس چکش کا علاج کیا کریے — راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جا نہیں بیٹھنے کو گھر کے بیچ — ہے چکش سے تمام ایواں کیچ

آنکھیں بھر لا کے یہ کہیں ہیں سب — کیونکہ پردا رہے گا یارب اب

جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات — گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات

باد میں کانپتی ہیں جو تھر تھر — ان پہ ردا رکھے کوئی کیونکر

کھینچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے — چھوپا کاہے کو بلکہ تھوپا ہے

تس کو پھر پرچھتی بھی ہی نہیں — ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں

ڈھانکو دیوار یا اٹھا رکھو — یا ہمارے لیے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق — سو شکستہ تر از دلِ عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک — کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر ہی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے — کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا — شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے — کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں — پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے — جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ادھر اودھر سے — لا کے یارب بناو کس گھر سے
چار پائی جب اس میں بچھوائی — پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے دوائے خُراج — ہر جگہ یاں سے ہے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے — ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
آگے اس حجرے کے ہے اک ایواں — وہی اس تنگ خلق کا ہے مکاں
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ — اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھی کوئی سنپولیا ہے پھرے — کبھو چھت سے ہزار پا ہے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے — کوئی واسا کہیں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مدِّ نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تودہ جو ڈالی چھت پر ہم — تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
پرسے اِس مینہ میں کرختی سے ہے — تختے تختہ ہوئے یہ سختی ہے
ہوئیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد — چل ستّوں سے مکان ڈھے ہے یاد

اینٹ مٹی کا ڈر کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچے
ورنہ کیا بس ہے جو نہیں پہنچے

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

توتا مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھرتھراوے بھنبھیری سے دیوار

ہوگیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اُڑ بھنبھیری کہ ساون آیا اب

نیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزون نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکی، تو ہے قیامت تنگ

ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اچھلے کہ ہال ہال چلے

نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں کھسکی
جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار
بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہونگے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے یک خرابی گھر در سے

اکھڑے پکھڑے کواڑ، ٹوٹی وصید
زلفی زنجیر ایک، کہنہ حدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں ہوں
قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
ہے خرابی سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھو اسے بتا دے شتاب
ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپّر ہے شہرہ دلّی کا
جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیے تھے سرکنڈے
سو وے مینھوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب
پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینہ میں کیوں نہ بھیگیے یکسر
پھونس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر

مٹّی ہو کر گرا ہے سب والا
وہ رہے یاں جو ہووے ڈھب والا

واں یہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
تگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
پینچ کوئی لڑا دوں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا
آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

ٹنکے جاں دار ہیں جو بیش و کم
تن یہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
ایک تگری یہ کر رہی ہے شور

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی — چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو — کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

ڈیوڑھی کی رہے یہ خوبی در ایسا — چھپر اس چوپچلے کا گھر ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ — پایے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی — چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں — سر پہ روزِ سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر — ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں — ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر — کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلایا جو پائینتی کے اوپر — وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

توشک ان رگڑوں ہی میں سب بھائی — ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان — ساری کھاٹوں کی چولیں نکلیں ندان

نہ کھٹولا، نہ کھاٹ سونے کو — پایے پٹی لگا ہے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لیے پایے — سیتلا کے سے دانے مرجھایے

سو یہ تنہا نہ بان میں کھٹمل — آنکھ، منہ، ناک، کان میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی — آنکھ سے تا نگاہ خواب گئی

ایک ہتھیلی میں، ایک گھائی میں — سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین، ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار
اس میں چل سالہ، وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ہمسایے وے ہیں ہم خانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتّوں کا رستا
کاش جنگل میں جا کے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دُتکاروں
ایک دو کتّے ہو تو میں ماروں

چار جاتے ہیں، چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبتِ نغز
کتّوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے
اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوٹھا بوجھل ہوا تھا، بیٹھ گیا
پانی جز جز میں اس کے بیٹھ گیا

کڑی، تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا
کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے، مٹی تھی یکسر
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا
پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھائے
یا ملک آسمان سے آئے

مٹی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں
کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی
ہم جو مُردے تھے جان سی پائی

آنکھ کھولی، اِدھر اُدھر دیکھا
اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرتِ حق دکھائی دی آ کر
یعنے نکلا درست وہ گوہر

داشت کی کوٹھری میں لا رکھا | گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ ہلدی | فرصت اس کو خدا نے دی جلدی
غم ہوا اس کے دوست داروں کو | پھر بندھا یہ خیال یاروں کو
کہ مری بود و باش یاں نہ رہے | گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے
شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں | چار ناچار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ | اور میں ہوں وہی فرو مایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس | خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں | رات کے وقت گھر میں رہتا ہوں

نہ اثر بام کا، نہ کچھ درکار
گھر ہے کاہے کا، نام ہے گھر کا

(۱۹)

خانۂ میر

جسمِ خاکی میں جس طرح جاں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں
ہے جو سر کوب اک بڑی دیوار
بختِ بد دیکھ سارے پرنالے
اب جو آیا ہے موسمِ برسات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے
مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے
اڑگئی گھاس مٹی ہے والا
اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
بند جھانکوں کو کیجیے تا کے

اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
واں سے جھانکو تو ہے اندھیر اغار
اس کے معمار نے ادھر ڈھالے
دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے
ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے
باندھتا ہوں مچان رہنے کو
یاں تو اک آسمان ٹوٹا ہے

ٹھیکی دینے کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ ٹھٹر لیے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تاکلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہے ایسی زندگانی میں

اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے
سر پہ گٹھری ہے تس پہ چھپّر ہے

پانی بہہ کر جھکا جو ہے دالان
سر پہ رہتا ہے طُرۂ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے
گریۂ زار سوگواراں ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینھ یک بارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے پایان کار ٹوٹ گئے
طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے

بہ گئے گولے تختے ڈوب گئے
غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں بیٹھی
جانِ غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھڑی تھی حباب پانی کا

یوں ڈھا گھر کہ بارِ خاطر تھا
آہ کس کا غبارِ خاطر تھا

اُکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کردیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا
وہی چھپّر کھڑا ہے گھر بیٹھا

جب اجارے پہ آگے چھت ٹھہری
ہم سمجھوں ہیں یہ مصلحت ٹھہری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

دبکے مرنے سے ڈوب مرنا خوب　　ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سن کے ہر ایک جی میں ڈر آیا　　خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی　　سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا　　اس کا سارا فگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا　　کوئی سر پہ اجاغ لے نکلا

چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا　　مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا

منھ پہ چھلنی کو ایک نے روپا　　ایک نے سرکئی کا کیا گھوپا

ایک نے چھینکے حال حال لیے　　پائے پٹی گلے میں ڈال لیے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا　　اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر　　الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر

صف کی صف نکلی اس خرابی سے　　تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے

پھرجی اس طرح سے آتے ہیں　　جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا　　ہنس کے بے اختیار وہ بولا

سن کے اس بات کو ترائے ہم　　بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب　　نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنی بود و باش کریں

(۲۰)

مینہ کی طغیانی

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات — جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کے سال — چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے — آسماں چشمِ واکو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں — تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب بن کوئی بولتا ہی نہیں — آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تنگ ہوگیا ہے پانی جو — ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب — چشمۂ آفتاب ہے گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے — موشِ دستی کے خار سبز ہوئے

ابر کس کس سیاہ مستی سے — ہوتے جائیں بلند و پستی سے

لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے — خاک بازی اب آب بازی ہے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی — پانی پانی رہے ہے بارانی

تنگ آبی سے جان مت اغراق — ڈوبنے پر ہے کشتیٔ آفاق

عقل مینہوں نے سب کی کھوئی ہے — بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفاں یہ مینہ چھایا ہے — زخمِ دل نے بھی آب اٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام و در
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماجِ بوند ٹپکاں ہے
مینھ ہے یا کہ تیر باراں ہے

جیسے دریا ابلتے دیکھے ہیں
یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

ابرِ رحمت ہے یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریقِ رحمت ہے

لے گئے ہیں جہان کو سیلاب
نقشۂ عالم کا نقش تھا بر آب

نہ ہے جلسہ نہ ربطِ یاراں ہے
شہر میں ہے تو باد و باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے
ان دنوں رنگ برق چمکا ہے

بڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریے
سنگ باراں جہاں ہو واں مریے

پڑھتے ہیں یار درسِ حیرانی
آرسی کے بھی گھر میں ہے پانی

آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں
مردمِ آبی پھرتے چلتے ہیں

کتنے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب
سگِ آبی ہی ہیں جہاں ہیں اب

وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار
کوچے موجوں کے ہو گئے بازار

معبد اب سارے گرتے آتے ہیں
زاہدِ خشک ڈوبے جاتے ہیں

تھا ٹھہرنا برابر اُن کے شاق
مسجدوں نے کیا ہے استغراق

مینھ تو یاں اب لگے ہی رہتے ہیں
سارے عالم کے کان بہتے ہیں

غرق ہے چڑیا یا گلہری ہے
خشکی کا جانور بھی بحری ہے

مینھ از بسکہ بہہ رہا ہے گا
اک جہاں کو ڈبو رہا ہے گا

شعر کی بحر میں بھی ہے پانی
بہتی پھرتی ہے اب غزل خوانی

لائی پا رندگی کی چالا کی
آبِ خشکِ گہر پہ تمنا کی

ہے زراعت جو پانی نے ماری　　ہوگئی آب خست ترکاری

آب ہے گا جہاں کے سر تا سر　　خوف سے سوکھتا ہے میوہ تر

مست ہو ہو گئے ہیں مست شراب　　غوطے کھاتے پھرے ہیں عالم آب

مستی ہے اب جو چاہیں سیرابی　　بط مے تو ہوئی ہے مرغابی

دست غم اس قدر بہ طغیاں ہے　　کہ ہر اک گوشہ بیچ طوفاں ہے

سیل دیکھی ہے کوہ ساراں کی　　لیے کشتی گدا ہے باراں کی

جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے　　جو ہے تالاب قہر دریا ہے

ہر طرف ہیں نظر میں ابر سیاہ　　پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ

سیلہا در رکاب دیدۂ ماست　　چشم تا کار می کند دریاست

پانی عالم کے تا بسر ہے گا　　خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا

خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے　　آب حیواں میں پانی مرتا ہے

لکھیے کیا **میر** مینھ کی طغیانی

ہوگئی ہے سیاہی بھی پانی

(۲۱)

بکری

کہتے ہیں ہا چو غم نداری بز بخر
مول لی میں ایک بکری ڈھونڈ کر

شعر زورِ طبع سے کہتا ہوں چار
دزدی بزگیری نہیں اپنا شعار

دزد ہے شایستہ خوں ریزی کا یاں
بلکہ باعث ہے بز آویزی کا یاں

میں پڑھوں؏ اس کے آگے شعر کہہ
اپنے ہاں گویا بزِ اخفش ہے یہ

بکروں کی ڈاڑھی کے تئیں جانے ہیں سب
تکہ ریشی بکری کی ہے بوالعجب

رنگ سر سے پاؤں تک اس کا سیاہ
چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ

چار پستاں اس کے آئے دید میں
دو جہاں ہوتے ہیں وو ہیں جید میں

ایک میں ان میں سے تھا مطلق نہ شیر
ایک کو کہتے ہیں اندھے خُرد و پیر

اس پہ کالے بکرے دو خیلا جنے
ناز نخرے سے رہے پھر انمنے

چارہ بیٹھے کھاتے اک انداز سے
دیتی ٹھہ تو ہوتے خوش اس ناز سے

دودھ ہو چھاتی میں تو بچہ پیے
بیٹھا دیکھے اس طرف منہ کو کیے

بھوک سے گرمِ تظلم وے ہوئے
اپنی شایانِ ترحم وے ہوئے

دودھ منگوایا گیے بازار سے
پھوہوں سے دینا کیا انفار سے

گھاس دانہ ہار سے کچھ کھانے لگے
گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے

پرورش سے حق کی بارے جی گئے — آب و دانہ دوڑ کر کھا پی گئے

اب جوانی پر جو ہیں وہ شیر مست — کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہے جست

مستی اپنی ماں پہ کرتے شاد ہیں — عاقبت بکرے ہی کی اولاد ہیں

زور و قوت سے حریفوں کی ہیں دھینگ — آہوے جنگلی کو دکھلاتے ہیں سینگ

ٹکّر ان کی کیا جگر، مینڈھا اٹھائے — قوچ سرزن سامنے ہرگز نہ آئے

سرزنی میں شہرۂ آفاق ہیں — لوگ بزگیری کے سب مشتاق ہیں

رنگ کو اس جنگ کا کیا ڈھنگ ہے — دبتے ہی میداں کا عرصہ تنگ ہے

ہوتے ہی استادہ طاری ہو غشی — کیا بزکوہی سے ہو میداں کشی

تیس ان کی دھاک سُن کر مر گیا — غم گوزنوں کو انھوں کا چر گیا

گور ٹکر کھا جو ڈگراتا رہا — بزدلی سے گرگ بھی جاتا رہا

مارے پانی پانی کر بکرے اصیل — لکھنو سے غل ہے تا بکرے کی جھیل

پاس جانا ان کے اب مسدود ہے — ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے

اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے
کاشکے ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

---

(۲۲)

منوا بوزنہ

تھا کپی کا بچہ اک درویش پاس
باش و بود اس کی تھی مجھ دلریش پاس

اس قلندر نے بحسب احتیاج
بیچنے اس کو نکالا لاعلاج

میں نے اس کو ایک جا دلوا دیا
مول ٹھہرا تھا جو کچھ سو لا دیا

بوزنہ یا کوئی تحفہ دہر کا
عزت افزاینده تھا اس شہر کا

نام منوا اس کا اب مشہور ہے
شوخی اس کی ہر کہیں مذکور ہے

ہے ہنومانی نسب یہ باب دید
قابل وصف اس کے حضرت بوحمید

ہے جو لکھو بندری مشہور اب
اس کی جدِ مادری تھی بوالعجب

اس کے پردادا نے ہی یہ حرف دی
ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی

ایک چنچل ہے بلائے روزگار
ہاتھ رہ جائے تو پا ہیں گرم کار

ہے تو بچہ سا و لیکن دور ہے
پست اس کی جست کا لنگور ہے

کیا کوئی انداز شوخی کا کہے
ہو معلق زن تو آدم تک رہے

اچپلاہٹ اس کی سب معلوم ہے
معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے

ہوتے ہیں قرّاد کب دیکھے سے سیر
اچپلی اس کی رہے ہے یاد دیر

حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب
پر ضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو چوب

ورنہ بوٹا سا جو قد ہے جھاڑ ہے
کھٹکھنا نچنا ہے کپڑے پھاڑ ہے

لونڈی باندی سب کو اس سے احتراز ۔ ڈر سے اکثر بی بیوں کے دل گداز

یہ جو چاہے چھوٹے تو تدبیر کیا ۔ رسی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا

ربط اُسے جس سے ہے اس سے ربط ہے ۔ مار کھانے پر بھی اس کو ضبط ہے

جب وہ چھوٹے شور و ہنگامے رہیں ۔ اب تو چھوٹا اب تو چھوٹا سب کہیں

چھوٹتے ہی گر پڑے کوئی بجوگ ۔ بندروں سے ناچتے پھرتے ہیں لوگ

ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد ۔ آدم و حیواں میں یہ برزخ ہیں بد

طنز سے یہ بات اگرچہ ہے کہی ۔ جو کرے انسان تو بوزنہ بھی

لیکن اس جاگہ تو صادق ہے یہ قول ۔ سارے اُس کے آدمی کے سے ہیں ڈول

ہے تماشا آئینہ کے روبرو ۔ عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو

دیکھنا جھک جھک کے اس کا ہو نہ ضبط ۔ آرسی بندر کا ہے مشہور ربط

گاہ بوسہ گاہ غُر غُر بولنا ۔ گاہ آنکھیں موندنا گہ کھولنا

آگے تھا اک بوزنہ شطرنج باز ۔ چال سے اس کی نکلتا امتیاز

کہنہ قرادوں سے ہم کو یاد ہے ۔ یہ اسی فتّان کا داماد ہے

جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے ۔ رہتے ہیں چانول پڑے اس کے کنے

آنکھ کب دوڑے ہے اس کی ہر طرف ۔ ہے یہ اپنی نوع کا فخر و شرف

الغرض منوا عبارت جاں سے ہے ۔ نام اس دلکش کا منوا یاں سے ہے

خوش رہے منوا تو خوش احوال میر ۔ ورنہ آدم ہے جوانی میں بھی پیر

دہر میں یارب نہ یہ محزوں رہے

جس کا منوا ہے اسے میموں رہے

(۲۳)

موہنی بلّی

ایک بلّی موہنی تھا اس کا نام — ان نے میرے گھر کیا آکر مقام

ایک دو ہے ہو گئی الفت گزیں — کم بہت جانے لگی اُٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ — دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

آئے ہے مجھ پاس اُٹھ کر یہ سویر — گربۂ زردِ فلک نکلے ہے دیر

یعنی وقتِ گرگ و میش آئے ہے پاس — پھر مرا پھیروں کیا ہے ان نے پاس

چیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے — فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

بختوں سے ٹوٹا ہے چھینکا بھی اگر — اُن نے اودھر کی نہیں مطلق نظر

دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے کی اور — ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھو کی ہو زور

اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا — خوف سے آپھی گیے کے چوہے ملا

ایک بلّی کچھ گئی تھی آکے چکھ — یہ لڑی تو منھ پہ پنجہ اپنے رکھ

برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو — آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو

لاگی ہو جو گھر سے جاتے تد رہوں — چلتے چھینکا ہو کبھو تو کچھ کہوں

تھی تو ظاہر جوں گڑاہی تیرہ رنگ — پر تماشا کردنی تھے اس کے ڈھنگ

شوق ہیں ہمسائیاں اس کے رہیں — جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں

پھرنے کو پھرتی تو کیا دلّی نہ تھی
پر چلے پاؤں کے یہ بلی نہ تھی

رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی
پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی

حاملہ ہو کر کئی بچے دیے
ایک دو بھی سو نہ ان میں سے جیے

متصل ایسا ہوا جو اتفاق
مرگ ان بچوں کی گزری سب پہ شاق

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا
جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا

نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈھ کر
نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر

چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے
بعضوں نے تعویذ لیکر خوں لکھے

بی بلائی سے بہت کی التجا
گربۂ محراب سے چاہی دعا

گوشت کی چیلوں کو پھینکی بوٹیاں
ماش کی موٹی پکائی روٹیاں

لڑکیاں بٹھلائیاں کھاٹوں تلے
اس طرح جوں دبکی بلی کم چلے

دیتے ٹکڑا منھ کو ہر اک کھولتے
اور بولی بلیوں کی بولتے

صدقے اترے چھیچھڑے جو ڈھیر ڈھیر
گربۂ لاوہ نے کھائے ہو کے سیر

کیں مناجاتیں دلِ شب لاتعد
گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد

بوہریرہ کے تئیں مانا بہت
بلیوں کے تئیں دیا کھانا بہت

مدح جس بلی کی کرتا تھا عبید
تھی دعا گوئی میں وہ بے مکر و شید

خواجہ عصمت کرتے تھے طاعت جہاں
ایک بلی بیٹھی تھی آکر وہاں

صبح دم ہوتی وہیں گرمِ سجود
گہ قیام اس کے تئیں تھا گہ قعود

چاہی ہمت اس سے اٹھکر ہر سحر
کچھ تو باطن نے کیا اس کے اثر

پانچ بچے اُن نے اس نوبت دیے
بارے سب وے قدرتِ حق سے جیے

کیوں نہ ایسی ہووے امدادِ بزرگ ‏— بی بلائی، بوہریرہ، سب بزرگ
اک توجہ رکھتے تھے ظاہر کی اور ‏— آرزو بر لاوے یہ باطن کی، زور
اپنی ماں کے رات دن پینے لگے ‏— پانچوں بچے دودھ کچھ پینے لگے
دودھ کتنا جو کہ بس ہو سب کے تئیں ‏— میں بھی منگوانے لگا کچھ شب کے تئیں
دودھ پیکر گائے بکری کا چلے ‏— روز و شب لوگوں کی آنکھوں کے تلے
دیر میں میں نے جو یہ ٹک غور کی ‏— بلیاں پانچوں ہیں یہ اک طور کی
دو مہینے تک بہت تھی احتیاط ‏— کتّے بلّی سب سے موقوف اختلاط
کوئی کتّا آ گیا ایدھر اگر ‏— لوگ دوڑے شیر سے منھ پھاڑ کر
در سے نکلیں سب ہوئیں بازی کی گرم ‏— زرد زرد ان کی دُمیں، منھ نرم نرم
لچھے ریشم کے سے چندیں رنگ خال ‏— کچھ سفید و کچھ سیہ، کچھ زرد و لال
آ نکلتی تھیں جدھر سے پانچ چار ‏— دو طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار
ایک عالم عاشقِ بیتاب تھا ‏— ان کی خاطر بیخور و بیخواب تھا
لے گئے ایک ایک کر سب تین تو ‏— منّی، مانی رہ گئیں مجھ پاس دو
منّی کی، پھر ایک صاحب نے پسند ‏— تھی بھی نازک ایسی ہی طالع بلند
مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار ‏— رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میرے اس کی خوابگاہ ‏— دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ
میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے ‏— جان پاوے سن مری آواز پائے
سب سے آگے آن پہنچے در تلک ‏— دیکھے میرے پاؤں سے لے سر تلک
آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے ‏— بلّی یا اعجوبۂ آفاق ہے

بلیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں / یہ تماشا سا ہے، بلّی تو نہیں

گرد رو باندھو تو چہرہ حور کا / چاندنی میں ہو تو بکّا نور کا

گرمِ شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق / بجلی میں اس میں نہ کچھ کر سکیے فرق

یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر / اٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر

کیسی ہی بلّی ولایت کی ہو زور / خوب دیکھو تو ہے اس کے صدقے حور

ربط ہے اپنے بھی جی کو اُس کے ساتھ / بیٹھے ہے تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ

ایک دن جا کر کہیں ٹک سو گئی / مانی مانی سارے گھر میں ہو گئی

بلّی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ / ہے کبودی چشم یک محبوب یہ

دیکھیے جس دم یک ذرا کوئی اس کو گھور / چشمِ شورِ آفتاب اس دم ہو کور

حسن کیا کیا مانی کے کریے بیاں / ہو جہاں جب تک یہ ہووے درمیاں

خوبی منی کی نہ کوئی کہہ سکے / دیکھے اس کو تو اس بن رہ سکے

داغِ گلزاری ہے اس کے تازہ باغ / اس زمانِ تیرہ کی چشم و چراغ

کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس / کیا مصاحب بے بدل کیسی جلیس

یہ نفاست، یہ لطافت، یہ تمیز / آنکھ دوڑے ہی نہ ہو کیسی ہی چیز

اس کو گر کعبے میں یہ ہو شوخ و چست / ہے کبوتر مارنا واں کا درست

چوہا چڑیاں ان نے کچھ کھایا نہیں / حج کو جانا اس کے تئیں آیا نہیں

حبِ ہرّہ جو کہ ہے ایمان میں / ہے اسی بلی کی شاید شان میں

ہے بہت منی کا جتنا آرزو / سو جنی دو بلیاں یہ ماہ رو

خال ہیں اُن پر بھی ماں کے سے عیاں / پر وہ خوبی اور محبوبی کہاں

موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام
پھرتی ہیں بھنڈناسی دونوں صبح شام

نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے
لوگ آنکھوں ہی میں رہتے ہیں کھڑے

حفظ ابھی بلوں سے ان کا ہے ضرور
رہیو ان دونوں سے چشم شور دور

دیکھے اُن کی اور جو ٹک کرکے خشم
کاڑھ کر دیں بلیوں کو اس کی چشم

قصہ کوتاہ موہنی آگے موئی
یک قیامت جان پر اس بن ہوئی

صبر بن چارہ نہ تھا، آخر کیا
بلی ماروں میں اُسے گڑوا دیا

شاد وہ جس کے رہیں قائم مقام
وائے اس پر جس کسو کا لینہ نام

(٢٤)

سگ و گربہ

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اوران کی ایک ہے جاں

رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ

کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ
بھوکا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مروت سے جائے کھانا چکھ
لڑے ہے بھی تو پنجہ منھ پہ رکھ

سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم
موش کی نسل ہوگئی معدوم

چوہا کیا ہے جو سامنے آوے
گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے

اُن نے جو ماریاں ہے گھونسیں و چھونس
موش دشتی ہوا ہے کونے کھونس

گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو
موش دشتی پہ کیا گزرتی ہو

کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے
سو وہ چوہوں کی مرثیہ خواں ہے

ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی
اپنے پاوں اجل اسے لائی

گھونس کیسی بتاوں غیرت سونس
طاق ہے جس کے آگے طاقت سیونس

یا کوئی مادہ خوک آبستن
یا کسی کچھوے کی برادر زن

پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال
پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال

کہیں اودھر یہ شیر جاتا تھا
پھیرتا منھ پہ پنجے آتا تھا

پڑگئی اِس کی اُس پہ چشم کبود
نیلا پیلا ہوتا دکھا جوں دود

پنجہ جھنجھلا کے اُن نے گزرانا / بارے کچھ گھونس نے اسے جانا

پر اُسے خوفِ جاں نہ آیا کچھ / غالب آیا نہ اس کا سایا کچھ

ٹھک ٹھکایا پھر اُن نے جا تالو / کیونکہ تھا یہ نوشیر کا خالو

پھر تو بگڑی ہے دونوں میں آکر / چوٹ ہوتی تھی داو پا پا کر

غصہ خرموش کو بھی آن چڑھا / اتفاق اس جگہ تھا ایک گڑھا

دونوں لڑتے ہوے گرے اس میں / کیچ کو گاہتے پھرے اس میں

ناخن اس شیر کا کچھ ایک گڑا / شور محشر گڑھے کے بیچ پڑا

شور کیسا محلے چونک اٹھے / سگِ بازاری بھونک بھونک اٹھے

یاں تو گھر بیچ کیا ہے کیا ہے پڑی / گھونس بلی نے چیچھڑے کر دی

کھڑے مونچھوں کے بال اکڑاتا / شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا

لیک جی سے تھا سب بدن خالی / کیونکہ سر سے بلا بڑی ٹالی

گھونس کے وارثوں کی کیا ہے تاب / کہ قدم کو رکھیں وہ حتی الباب

کوئی چھچھوندر اب اس پہ روتی ہے / کہ تری لاش خوار ہوتی ہے

تو جو تھی ساری قوم کی سردار / سو اٹھایا ہے زخم دامن دار

ہم بہت غم میں تیرے روئیں گے / بل کے بل اب خراب ہوویں گے

فخر ہے اپنی نسل کا یہ شیر / جن نے گھونسوں کے کر دکھائے ڈھیر

سنا ہے موش و گربہ کا قصہ / وہ جو ہے گا عبید کا حصہ

جس کو باندھا عبید زاکانی
لگتی تھی اس کی وہ سگی نانی

قطعہ

گربہ تا بود فاسق و فاجر صید او یک بدے بہ سالانا
این زماں پنج پنج می گیرد کہ شدہ مومن و مسلمانا

تعریفِ مادہ سگ

ہے جو وہ مادہ سگ تماشا ہے دوڑ پڑنے کے وقت باشا ہے
کسی کے لقمے پر نہ منہ ڈالا سگِ اصحابِ کہف کی خالا
نہیں کتوں سے خوارئیاں کے یہ ہے سگوں میں عزیز خاں کے یہ
دے ہرن کو بھی جلدی میں نتا ہے گا یاں سگِ لوند کیا کتا
اڑتی چڑیا انہیں نے ماری ہے استخوانِ سگِ شکاری ہے
یہ جو غصے میں آوے تو ہے غضب اس کے مارے ہوئے ہیں ہارے سب
منہ میں دیتے ہیں اس کے جب مشعل طرفہ دم لابہ کرتی ہے اچپل
منہ میں اپنے لیے فتیلے سے سگِ لیلےٰ کے ہے قبیلے سے
باہم اس کتے بلی کا یہ ربط کوئی دیکھے نہ ہووے اس سے ضبط
کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر لگی رہتی ہے اس کی چھت سے نظر
اور سے دشمنئ جانی ہے اس کی یہ باولی دیوانی ہے

دونوں شوخی سے مار رہتے ہیں
سگ و گربہ کی چال رہتے ہیں

(٢٥)

مرثیہ خروس

کئی برس سے ہمارے کنبے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے ولے افسوس

بچھڑا جو اس سے یکایک زمانۂ کج باز
قضا نے اس کو کیا ایک بار مرغ انداز

دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح و شام
بجا ہے مرغ مصلّی رکھیں گر اس کا نام

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
برنگِ کلّہ تاجِ خروس سر پر تاج

جو بیٹھے چھانپے میں پرواز پر ہے مرغِ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشکِ مرغ زریں بال

کبھو جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیار
پھرے ہے کیس کو ڈالے تو مرغ آتش خوار

بطخیں ہیں ثنا گستری میں اس کی مدام
بزرگ داشت کریں مرغ سبزوار تمام

رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعد جنگ
طرف نہ اس کے ہوئے بچ گئی ہیں قاز و کلنگ

جب اُن نے گانٹھ کے اک لات حلق پر ماری
شتر دلی کی شتر مرغ نے کئی باری

نہ اس کے سامنے کوئی کھڑا رہا مرغا
جو اصل اس سے بگڑتا تو تھا وہ کیا مرغا

بجز کنارہ نہ سیمرغ کو بنا چارا
کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا

ہمیشہ گربہ و سگ سے تھی روک ٹوک اسے
جہاں سے لے گئی آخر یہ نوک جھوک اسے

خصومت اس کی تھی یک مادہ سگ سے شام و سحر
کبھو وہ لات اُسے مارتا کبھو شہپر

قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجلائی
حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

پپیہا تھا نہ سمجھا ادا کو کینے کی — لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی
ہلائی ان نے بھی گردن لگی کہیں بیکل — کہ ایک دم میں گئی آہ اس کی گردن ڈھل
جھکا جو خاک کی جانب جو کیس بیجاں کا — زمیں پہ تاج گرا ہدہدِ سلیماں کا
ہوا کے مرغ ہوئے داغ اس کے ماتم سے — سیاہ پوش رہے طائرِ حرم غم سے
وہاں نوحۂ مرغان قدس باز ہوا — کہ مرغ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا
قفس کے مرغ نے سن ترک آب و دانہ کیا — لمیور نے بھی نہ پھر قصد آشیانہ کیا
ہوا زبسکہ پراگندہ یہ غمِ جاں سوز — اداس رہنے لگے سارے مرغ دست آموز
خروس عرش ہی اس بن نہیں ہے سینہ فگار — ہزار مرغ کا اب گھر خروس پر ہے بار
زمانہ جب تئیں ہے اس کے درد کے مارے — رہیں گے خاک فشاں مرغ خانگی سارے

خموش میرؔ تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

---

(۲۶) آغا رشید خطاط

میر خطاط یک قلم دیکھے — لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے
یعنی عبدالرشید تھا اُستاد — خوشنویسی کی جن نے دی ہے داد
خط کی خوبی کا اس کی انیک ڈھنگ — صفحۂ روزگار پہ ہے رنگ
وہ تصرف کہیں جو کرتا ہے — شکلِ نقاش رنگ بھرتا ہے
حیرت افزا ہے حسن ہر تحریر — مشقی اس کی ہے قطعۂ تصویر
خط شیریں جو اس کا پاتے ہیں — ہم حلاوت بہت اٹھاتے ہیں
لگ گئی ہے قلم تو جادو ہے — مد جہاں ہے کسو کی ابرو ہے
سطر لکھتا نہیں خفی کی وہ — خط ہے خوباں کی پشتِ لب کا وہ
ایسا لکھنا کسو کی طاقت ہے — ہے جلی بھی تو ایک بابت ہے
خط میں کیسا ہی کوئی کامل ہو — اس کا کب نقطۂ مقابل ہو
حرف کس کس ادا سے لکھتا ہے — کون ایسی صفا سے لکھتا ہے
ہے الف قامتِ نکورویاں — لام ہے زلف سلسلہ مویاں
دال کا خم رہے ہے ایسا خوب — جیسے جھکتے ہیں مست ہو محبوب
میم جس لطف سے لبالب ہے — دہنِ تنگ خوشاں کب ہے
ہے کشش فازۂ تنِ خوباں — دائرہ دور دامن خوباں
دائرہ نون کا اس نمط کھینچا — کہ خطِ دلبراں پہ خط کھینچا
مدعی کو جو خط دکھاویں ہم — جیسے حرفِ غلط اٹھاویں ہم

(۲۷)

مرغ بازاں

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے / گرم پرخاش مرغ یاں پائے

پر و پرزا درست و یکساں ہے / مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ / قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ

حوصلہ کس قدر جو اصیل کا / ذکر کیا کرگس شتر دل کا

لات کی گھات کر جو مڑ جاوے / نسر طائر کا رنگ اڑ جاوے

زہرۂ ققنس کا اس خطر سے آب / شب نہ سووے ہراس سے سرخاب

بکری سا فیل مرغ کو مارا / کب شتر مرغ سے ہوا چارا

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں / مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

سرخہ و سبزوار کے سب مرغ / ہیں ثنا گر ایسے تھے کب مرغ

ہو جو کیں مرغ خانگی کے تئیں / مت سن اس ہرزہ چانگی کے تئیں

لات مارے جو گانٹھ کر حلقوم / حیدرآباد تک پڑے ہے دھوم

کھا کے سینے کی مدعی سووے / نسر واقع کا واقعہ ہووے

نے ثنا سے لطیبی ہی ہیں تر لب / مرغ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب

ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے / اس کے آگے کنیل پھیکا ہے

کیا عجب ان کی رہ گزر کا فرش / ہوں پرافشاں تو ہو خروس عرش

اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست　　کی صدا مرغ دوست نے ہے دوست

کیس اس رنگ ہوتے ہیں محسوس　　جوں گلستاں میں گیا ہووین تاجِ خروس

شورِ جنگ آوری کا تا کہسار　　کبک کا گھر خروس پر ہے بار

کب ہیں پہلے سے مرغ زریں بال　　حسن لاکھے کا سمجھے مرغ خیال

کر سکے وصفِ مرغ کیا کوئی　　مرغ آمین کو دعا گوئی

وقر اتنا کہ دیر بچے لیں　　جان دے کوئی تخمِ مرغ نہ دیں

مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا　　درِ الطاف باز کر دیکھا

ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ　　ایک پَر مرغ کا نہ آیا ہاتھ

مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز　　مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز

یعنے اپنا حریف جب پاوے　　پَر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے

سینہ کیا سینہ بال کیا پر و بال　　جیسی چشمِ خروس آنکھیں لال

بازی بد بد کے جب لڑاتے ہیں　　کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں

آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار　　پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار

ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ　　پانی کرنے لگا تر آکر وہ

کچھ جو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے　　تعبیہ کر کے رکھ لیا اُن نے

اور جو سست ہو ہوا تھیلا　　دونوں بازو کے پر دیے پھیلا

دم سے کیا ہو یہ بے دم و مجروح　　قصدِ پرواز میں تھا مرغِ روح

ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور　　ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور

پھیلا پالی میں بھی غمِ جانسوز　　دل زدہ پھر ہیں مرغ دست آموز

جانور رنگ باختہ سب ہیں
یعنی حیران فاختہ سب ہیں

مرغ قبلہ نما کو وحشت ہے
بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اُڑ کر کہیں چلا جاتا
دیر اپنے مقام پر آتا

جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم
گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں
سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

ان نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے
ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

مرغ کی ایک پر فشانی ہے
ان کی صد رنگ بد زبانی ہے

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ
ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ

جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں
لاتیں گویا کہ یہ بھی کھاتے ہیں

ایک کے منھ میں مرغ کی منقار
ایک کے لب پہ ناسزا گفتار

منھ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے
تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے

طرفہ ہنگام طرفہ صحبت ہے
بعد نصف النہار رخصت ہے

کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیسے ہارے سارے مرغ

پھر جو روزِ معین آوے گا
نالہ مرغِ سحر سناوے گا

عالم آوے گا گرد ویسا ہی
گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی

میر ان کا نہ ہووے گو قائل
مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

(۲۸)

اژدر نامہ

یہ موذی کئی ناخبردار فن — نئی ناگنیں جن کے ٹیگوں پہ پھن

نہیں جانتے ہوں ہیں مارِ سیاہ — زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ

نفس ہے مرا افعیِ پیچدار — گیا جس سے خصمِ قوی من کو مار

جدھر بھر نظر دیکھوں لگجائے آگ — گہہ دم کشی لب پہ کھیلیں ہیں ناگ

جہاں میں ہوں وہ جا ہے پر شر و شور — عصا سے چلے راہ واں مار و مور

مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا — جلا آگے میرے کبھو کب دیا

سُن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا — کہاں کیچوے یہ کہاں اژدہا

نہ خصمی مری اژدہوں سے ہوئی — طرف مجھ سے ہو جونک کیا ادھموئی

اگر شورِ زاغاں سے ڈر جائے مار — تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار

نہ کس طور اژدر کو تلوا سر ہو — حریف اس کی سوکھی سی چلپاسہ ہو

کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی — کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ — ولے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چپٹ

جہاں شور اژدر سے ہے دھوم دھام — کوئی کنسلائی سے نکلے ہے کام

بظاہر یہ لاوے تو ہیں پر نکال — ولے ہوں گے ان کے جیوں کے وبال

حریفی انھوں سے ہو اژدر کی کب — وہ کھینچے جو یکدم تو پھندکا ہیں سب

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میرؔ | سر راہ کہتا تھا جو اک فقیر
کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم | درندوں کے بھی اس سے دل تھے دونیم
نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر | پلنگ و نمر واں نہ رہتے تھے دیر
جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب | شغال اور روبہ کا واں کیا حساب
وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک | دم اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک
نکلتا تھا جب بہر برگ و نوا | شجر کے شجر ہوتے تھے تب ہوا
کہاں سایہ اس جا و سبزہ کہاں | درخت اس کے چاٹے رہے تھے واں
صدا جب مہیب اس کی ہوتی بلند | جگر چاک کرتے ہوا سے پرند
درندوں کے بر جا نہ رہتے حواس | چرندے مکانوں سے ہوتے اداس
وحوش اس بیاباں میں جاتے نہ تھے | طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے
کبھو اس کی رہ میں جو اٹھتا غبار | تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار
پہنچتا تھا گردوں تلک شور و شر | ہوا صاف ہوتی نہ دو دو پہر
رہا کرتی کوسوں تلک اس کی دھوم | نہ اس راہ آتا کوئی جز سموم
ہوئے ساکنانِ بیاباں بتنگ | اٹھے کوہ و وادی سے شیر و پلنگ
گئے جان لے لے وحوش و طیور | کوئی رہ گیا موش و مینڈک سا دور
گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی | کسو اور جنگل میں بھوکی ہوئی
گلے میں جو یاں کے کھلے اس کے لب | ہوئے واں کے اعیانِ گرم غضب
خراطین و خرموش و موش و شغال | اس اژدر کو کر جنس اپنی خیال
رواں ساتھ اس کے شتابانہ ہوئے | کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے

رعونت سے مینڈک اچھلتے چلے
بلوں میں سے چوہے نکلتے چلے

قریب اس بیاباں کے جس دم گئے
انھوں میں سے آگے بہت کم گئے

قضارا وہ آفت تھی سرگرم سیر
چلے آتے تھے بھاگتے وحش و طیر

اس آشوب سے دست و پا گم کیے
فراموش سب نے سر و دم کیے

لڑا ڈر کے خرموش سا پہلوان
ہوا مضطرب کیچوے سا جوان

وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی
ہوئی خوف سے اس پہ طاری غشی

قدم غوک سے گرد کا چل گیا
بھروسا تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا

جہاں پہلواں موش رستم معاش
لگا کرنے میداں میں بل کی تلاش

کہ سوراخ پاوے تو روپوش ہو
یہ تشویش یک دم فراموش ہو

ولے چھوڑتا کب ہے خصمِ قوی
کہ ہو خوفِ جاں سے کوئی منزوی

پراگندگی تھی اُس انبوہ میں
کہ گونجی بلا سے سیاہ کوہ میں

اس آواز سے جی نکل ہی گئے
جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے

سیہ جب ہوا ہو گئے منھ سفید
ہوے مدعی جان سے ناامید

بھرا ایک دم اُن نے وا کر دہاں
کہ پایا اس انبوہ کو نیم جاں

دمِ دیگر اُن سے نہ کوئی رہا
وہی دشت خالی، وہی اژدہا

زبانہ وہی آگ کا چار اور
ہوا گرم ویسی ہی، ویسا ہی شور

وہی دم کشی شام سے تا سحر
اسی ہولناکی سے وہ دشت و در

گئی یہ خبر جس بیابان میں
رہی سدھ نہ کچھ واں کے سکّان میں

کنھوں نے کبھو منھ نہ ایدھر کیا
نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا

مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ — طرف ہوں مرے ان کی طاقت ہے یہ

جو مجھ کو ہو کچھ بھی انھوں کا خیال — تو یہ مار گیری کریں کیا مجال

تو کیا ہو انھوں سے بہت دور میں — ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ، پیٹا کریں اب لکیر

---

(۲۹)

تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں، تو یہ فن شریف ۔۔۔ کسب کرتے جن کی طبعیں تھیں لطیف

تھے ممیز، درمیاں انصاف تھا ۔۔۔ خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو ۔۔۔ کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

تھے جو اُس ایام میں استاد فن ۔۔۔ ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں ۔۔۔ کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کارخانے میں نہ ہو ۔۔۔ ٹوٹی جوتی کو کہاں لے کر پھرو

چار و ناچار اس کنے جانا پڑے ۔۔۔ کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں ۔۔۔ جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کو کمال ۔۔۔ دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جا ہے رونق بخش سمع ۔۔۔ واں کی دینداری کھو اور دل کو جمع

جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں ۔۔۔ گو یقین ایمان کیسا، دیں کہاں

ہم تلک بھی تھی وہی رسم قدیم ۔۔۔ یعنے جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انھیں استاد فن ۔۔۔ ان کے ہوتے رہبر راہِ سخن

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار ۔۔۔ شاعری کاہے کو تھی اُن کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا ۔۔۔ شعر سے بزّازوں، ندّافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا
جو کوئی آیا اسے دی پاس جا

ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو
کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دینا کس کے ہاتھ
پھر اسے مجلس میں لاے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ
کرنے لاگے شاعری سے حرف و گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال
ذہن ان کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی
اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید
سب نے جانا ان کو شاگردِ رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن
آگے استادوں کے ہو گرمِ سخن

ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

نیم قد اٹھ اٹھ کے یہ سننے لگے
جا و بیجا سر کے تئیں دھننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعوی طبع لطیف
میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد
آفریں شاگرد و رحمت اوستاد

جب تلک یاں تھی تمیز زشت و نیک
کاہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہلِ فن کی رہتی تھی سب کو تلاش
ان کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش

جو کہ خود رکھتے تھے استادوں سے عار
اُن کے تئیں ہرگز نہ ہوتا اعتبار

زندگی بلکہ انھوں پر شاق تھی
ہاتھ گر لگ جاتے تھے تسلّاق تھی

حکایت

شائقِ فن تھا وزیر اصفہاں
ایک دن آیا ہلالی اس کے ہاں

حاجبانِ در سے ہو آگاہِ کار — کی اشارت تا اسے دیں گھر میں بار

عزت و تعظیم کی حد سے زیاد — پاس لے مسند پہ بیٹھا شاد شاد

ان نے کھینچی اس کی مرزائی بہت — بیٹھے بیٹھے رات جب آئی بہت

شعر کی تقریب لا کر درمیاں — کرنے لاگا شاعری کا امتحاں

شعر خوانی کی پڑھا سو تھا غلط — سنتے ہی بھڑکا وہ شعلے کی نمط

غصہ ہو بولا کہ ہاں فراش و چوب — کھینچ لا میداں میں کی شلاق خوب

اس قدر مارا کہ بے دم ہو گیا — سوج دست و پا ہر اک تھم ہو گیا

کھینچ کر ڈلوا دیا دربار میں — یہ خبر پہنچی جو ہر بازار میں

وارث اس کے لے گئے آ رات کو — جب بخود آیا تو پایا بات کو

یعنی دستورِ زماں دشمن نہ تھا — یا وہ کچھ ناآشنائے فن نہ تھا

غالباً پایا غلط اشعار کو — خوش نہ آیا اس کرم کردار کو

ورنہ شیوہ اس کا ہے لطف و کرم — جائزے میں دے ہے دینار و درم

مجھ کو کیوں شلاق کرتا اتنی شب — کاہیکو بدنام ہوتا بے سبب

پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور — جا کے بیٹھوں اک سر آمد کے حضور

صحبت اکثر رکھوں اس استاد سے — شاید اس کی دولتِ ارشاد سے

پہنچے اک رتبہ کو میری قیل و قال — ہو مجھے اس فن میں یک گونہ کمال

اٹھ گئے آیا مولوی جامی کنے — مشق کی یک چند اس نامی کنے

جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند — اور مولانا لگے کرنے پسند

پھر گیا اک دن درِ دستور پر — حاجبِ درگاہ نے کی جا خبر

کا اے امیر اس روز کا شلاق خوا
کی اشارت سد راہ کوئی نہ ہو
سامنے آیا تو کی نیچی نظر
بعد ازاں ایماے ابرو کی کہ ہاں
پھر وہیں سے دے صلہ رخصت کیا
اگلی صحبت کی تھی عزت اسقدر
اب کی اس کو جائزہ دیگر گراں
میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا
ایسے ہی ہوتے ہیں تضحیک سلف
اس قدر اس کا تنبہ تھا ضرور
جو سنے سو خودسری سے باز آے
ورنہ کرتا یوچ گوئی ہر دبنگ
تب جو میں شلاق کی یہ خام تھا
قصہ کوتاہ تھے ممیز درمیاں
بے تمیزی سے ہے رائج ابتری
نے بیاں کا ہے سلیقہ نے زباں
بس قلم وقت زباں بازی نہیں
کون حرف خوب کو کرتا ہے گوش
بے تمیزوں سے بھرا ہے سب جہاں

آج در اوپر ہے پھر خواہانِ بار
قصد ہے برخوردکا تو آنے دو
دھوپ میں جلتا رہا وہ اک پہر
صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں
اک مصاحب نے جگر کر کر کہا
سو ہوئی شلاق حد سے پیشتر
تو نے فرمایا مرخص واں سے واں
در جواب اس برگزیدہ نے کہا
دست ہو تو ان کے تئیں کرتے تلف
تا کہ پہنچے یہ خبر نزدیک و دور
تربیت ہونے کو استادوں کے جلے
رفتہ رفتہ شاعری ہو جاتی تنگ
اب جو آیا لایقِ انعام تھا
ننگ ہے کرم مزابل پر بھی یاں
جس کو دیکھو خودنمائی خودسری
اس پہ ہے ہر ایک سحبانِ بیاں
چپ کہ دورانِ سخن سازی نہیں
بات کی فہمید کا ہے کس کو ہوش
ہے دماغِ حرف ہم کو بھی کہاں

(۳۰)

ہجوِ نااہل

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام
پر نہیں مرغی کا اگر م طیر ہے
کام مجھ کو کچھ نہیں ہے اور سے
شاعری کو میری ہو گے جانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں با وقار
گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا
کیا ہوا گر چاند پر پھینکے ہیں خاک
رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے
ایک باتوں سے مری آدم ہوا
ایک نے دیوان کی میرے نقل لی
ایک میرے طرز پر کہنے لگا

چھیڑتا ہے مجھ کو اک ت...... م
وہم میں شہباز کا ہم سیر ہے
بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے
تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا
پڑتی ہے اُن سب کے منہ پر میں ہوں پاک
مدعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ
دردمند و عاشق و دل ریش تھا
غصّے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تپ
مدتوں یہ لونڈے آے مجھ کنے
یک نظر سے شہرۂ عالم ہوا
اُس دوانے کی کنھوں نے عقل لی
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا | مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید | کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی بے تہ گو نہ جانے میری قدر | پائیں ہیں پائین آخر صدر صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے | ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

ایک لیجا دے جو اک عمدے کو بھوگ | تو اُسے کیا کچھ طرف جائینگے لوگ

جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے | ایسے لچّے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بیست سال | گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال

کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف | ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اک نو مشق تھے گرمِ سخن | سو بچارے آپ ہی ناآگاہِ فن

مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر | مردۂ صد سال سا بے نور تر

کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود | قلیۂ دہ روز سے بھی بد نمود

آتے اچھا ہے جو اس کو روک دو | ورنہ منھ دیکھو تو وہیں اوک دو

باپ اس کا سخت ناداں نادرست | گوڑے کی سی گندی بلی قاق و سست

ایک جا آیا شتر قد گھر گیا | واں شتر غمزہ سا مجھ سے کر گیا

رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ | یعنے دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

اس تحمّل پر نہ کی مطلق نظر | خار پہلو کا ہوا ہر جا بچر

جب لگا ہی ناچنے مستی سے خوب | تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب

مستی اس کی ساری اب جھڑ جائیگی | دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائیگی

جب بڑوں سے مار ناہموار کھائیں | کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے — اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز — اِس کی خلقت کم ہے کیا اے بے نیاز

ہیئت اس کی مضحک ہے سوانگ ہے — جدِ عوج بن عنق کی ٹانگ ہے

سر کے تئیں اس کے جو دیکھوں کر نگاہ — بانس پر ایک اوندھی ہانڈی ہے سیاہ

تیرہ رو مضحک سراپا زور ہے — دُم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے

شکل و صورت دیکھ کر حیران رہو — بے تکا سب مل کے الگ الگ ہی کہو

بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا بو تیمار — آتے جاتے جاویں اس کو جوتی مار

چال جب چلنے لگے سر جھاڑ کر — پاؤں کو پہلے رکھے منہ پھاڑ کر

پاؤں اوپر رکھتا نہیں بے پاؤ سر — ورنہ یہ بھی تھا عجائب جانور

ایک دن بیٹھے تھے یاں ذات شریف — وارد اس دن ہو گئے کتنے ظریف

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو — یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو

یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں — سر کہیں ہے پاؤں اس کے ہیں کہیں

ایک کہے آیا مکوڑا وہم میں — ایک کہے مورِ سواری فہم میں

ایک نے ہنس کر دیا اس کو ڈھکیل — اور بولا اے تری قدرت کے کھیل

کیسا اعجوبہ نیا پہنچا ہے یاں — چوچ بچ ہو تو ہے شترِ مرغ کلاں

ایک بولا کر کے چشمک پیری اُدر — واہ صاحب جانور پالا ہے زور

ایک دن باہر تو ہو لیے کر گھڑے — یہ اچنبھے یوں نہیں رہتے پڑے

جائے اس وحشی کا ٹک وسواس بھی — چوک بھی ہے پاس یہ نسناس بھی

اس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا — لیک یہ خر ناشخص ہی رہا

یہ جو ہے موشک دوان و شور چشم
موش دشتی چہرہ و شب کور چشم

بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا
مستحقِ لعنتِ عالم ہوا

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا
پاس کب تک کیجے نام و ننگ کا

یاں زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا

ناقباحت فہم کو دعویٰ بڑا
ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے
چیونٹی کا کیا جگر جو منھ پہ آئے

جنگ ہاتھی کی ہو گو اس کو ہوس
پر اُسے ہے موت کا ریلا ہی بس

ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی
پودنے کی سی ہے اس کی ضامنی

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد
پر کمی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد

قبلہ کہتے کہتے ہاجی ہو گیا
پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

رشکِ شہرت سے مری مرنے لگا
میری عزت کا حسد کرنے لگا

لگ گئی چپ اس کو میرے شور سے
یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اُور سے

یہ قبولِ خاطر و لطفِ سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

خصمی وہ کرے ہے کہ ہو معقول خلق
نے انھوں سے جو کہ ہو مقبول خلق

دشمنی تھی اس کو مجھ سے کیا ضرور
حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور

ہول جو ہیں پرتو فگن تو ہے یہ کیا
خور کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا

خونِ دل آشام ہیں جو صبح و شام
دے بھی لیتے ہیں دب سے میرا نام

یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے
یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

میں نے الٹی اجگروں کی دم میں صف
ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ نا سید کہے ہے کیا چمار

ہجو کی جو اُن نے میں کیا دب گیا
بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا

ننگ ہے میری توجہ اس طرف
حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف

دارو دستی سے ہے اُس کی مجھ کو شرم
تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم

ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے
ورنہ یہ ملعون کیا کنّاس ہے

جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس
کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم
تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز بوم

ایک بدیمنی ہی ہے گی بوم میں
لطف وہ پاتے ہیں ہم اس شوم میں

دیدنی ہے قدرت ربّ ودود
ایسی اچرج کم ہی ہوتی ہے نمود

کیا کمی ہے یہ جو عزّت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہے تعظیم میری کائنات
لعنت اس پہ ہوتی ہے دن اور رات

بیت کہنا چاہتا ہے بے ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

نامبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
الو ہے اور الو کی مادہ بھی ہے

عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور
ہے کسو حافظ کا نطفہ ماچہ خر

پر وہ حافظ جو ہو قرآن خوانِ قبر
اس سے لیں کارِ تلاوت کو بہ جبر

جھڑ گیا ہووے دماغ اس کا تمام
پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح شام

وہ خرف جورو سے جا یک جا ہوا
ایسا الو ماخڑا پیدا ہوا

دیکھ کر ان کی خرامی پائے سرو
ایک کوّے نے کی تقلید تدرو

کود کر چلنے لگا آخر کو راہ
اپنی بھی رفتار بھولا روسیاہ

کاشکے ہو ویں مخدرِ شیخ و شاب ؟
چھوٹا سا منہ جو پکارے کا ہے باب

بد نمائی اس کی ہے بیساختہ
کیا ہے یاں میش بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ
کیا بلا ہے مادہ خوکِ حاملہ

گرگ گردن خوک چشم و غوک سر
غولِ صحرائی کا ہے بچہ مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فنِ مشکل کا ماہر ہو گیا

باپ کو اُن نے بنا رکھا ہے اوت
ہیں کہاں ایسے سعادتمند پوت

کم ہوا ہے گا جو اس کا زورِ پا
جانتا ہے اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سِرِّ کار
تب تو ٹھہرایا ہے اس کو رازدار

اس زنازادے نے جو لب وا کیا
پہلے ماں کا راز ہی رسوا کیا

ایک ہی شب کے تئیں جلوہ دیے
ی..... ماں کے باپ کو دکھلا دیے

پھر حقیقی باپ سے جا کر ملا
اس مجازی کا کیا اس سے گلا

پیسے اس کے کھا کے جب کُتّا ہوا
یاں کسی تقریب آ پیدا ہوا

تب سے روز و شب اسی کے ساتھ ہے
اِس خرف کی ڈاڑھی اس کے ہاتھ ہے

بس قلم نفریں ہے میری بس اُسے
ہے دماغِ بحثِ پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں پواج

(۳۱)

مذمتِ آئینہ دار

آج سے مجھ کو نہیں رنج و ملال
جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب
مدعیِ شعر ہیں حجام اب

اِن سے کیں اِک مو برابر بھی نہیں
جلف اشرافوں کے ہمسر ہی نہیں

پر ہوے سر چڑھ کے یہ موے دماغ
دود ہو جانے لگے سوے دماغ

ہو گئے گرمِ سخن تب تو قلم
ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا قلم

ایسے مونڈے میں نے کتنے بے شعور
ہے حجامت اس بھی فرقے کی ضرور

یاں نہ سید کچھ ہے نے نائی ہے شرط
ہو کسو صنعت میں دانائی ہے شرط

سنگ کو نجم الدین کی سرداری ہوئی
نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی

میر و مرزا میں حکم ہووے خرد
نے کہ نائی جن پہ سب کا دست رد

سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
یاں نائی ہو واں عجالت ہے بہت

جس جگہ میں نے رکھی منھ میں زباں
ہوتے اُس جا گہ جو مرزا بیگماں

اُسترے کانوں میں اپنے باندھ کر
کب کے اب تک گھس گئے ہوتے اِدھر

ان کمینوں کا گلہ کیا کیجیے
ایسے دس پیدا ہوں گر نہ لیجیے

کہتے ہیں سرگرمِ بیباکی ہو یہ
ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ

لکھیے اس فرقے کی اب تا چند دم — خط بنا دے ایسا کر پے کف قلم
گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار — لیک ان کا منہ نہ دیکھیں کاش یار
صاف قینچی پر انھیں چڑھوائیے — گر نمد ہو اس میں پھر ہو جائیے
چار ہو ہو اس قوم کی کیا شرح حال — آگے ہی آوینگے جتنے ہونگے بال
اک سفید ان کو نہیں چننے تک — ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک
کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچر — کیجیے اصلاح عاید ہووے شر
کھرچیں ایسا سر کہ کر دیں پائمال — سیدھا جب سن لیں تب لیں الٹے بال
معتبر ان کے جو حمامی ہیں اب — ہند میں وہ تیرہ روشامی ہیں اب
کوئی لیجائے جو حاجت غسل کی — چلّو چلّو پانی پر دیتے ہیں جی
لعنتیں کرتے ہی گزرے اس کو واں — غسل میں فرصت تشہد کی کہاں
بیٹھے جامہ خانے میں کیا غسل کر — جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر
ایک پھر اجرت کے اوپر جنگ ہے — لات ہے گالی ہے پھر پھر جنگ ہے
اس سقاوے میں گیا تھا اک حریف — اس کی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف
دھو کے پاجامہ نہانے بھی گیا — یک طرف پھر پائنجامہ بھی گیا
غسل کے پیچھے جو منہ گھر کو کیا — ہاتھ نائی کے سوا پیسہ دیا
نائی نے پوچھا کہ پیسہ یا ٹکا — دمڑی یہ کیسی ہے میں قربان گیا
ہنسکے بولے تو نہ بدلے جائیو — یاں ہگا بھی ہے اسے اٹھوائیو
چوہڑے نائی ہیں سارے ایک ذات — ان میں ہے بدذات جو ہو نیک ذات
کاٹیے ان کے تئیں مثل گزر — بنڈے کے ہلکے ہیں اکثر ماچہ خر

بعضے بعضے ان میں سے جرّاح ہیں
بحرِ خون و ریم کے ملاح ہیں

زرد و زنگاری کوئی ڈبا ہے ساتھ
حیض کے سے ایک دو لتّے ہیں ساتھ

موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں
پھر مسیحائی کا دم اس پر کریں

پھیر پگڑی بیٹھیں ایسی شان سے
آئے ہیں گویا ابھی ایران سے

باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں
داغ کو اس کے جراحت کر دکھائیں

بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر
سو مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر

رنڈی گت ناچے یہ اس کا منہ دکھائیں
پا بہ پا مشعل لیے مجلس میں جائیں

روشنی لے دوڑتے ہیں وقت شام
گھورتے ہیں کر کے اندھیارا مدام

تیل کی کپّی لیے خوش ہیں کھڑے
ایک بھڑوے ہوتے ہیں چکنے گھڑے

لگ چلیں تو ہینگے جیسے مو چنے
کھائیں جب سر میں لگیں تب سوچنے

چھیڑیو تو مغز بھی لیجائیں گے
سر کے تئیں سہلا کے بھیجا کھائیں گے

بے حقیقت ہے نہیں شایانِ کار
صحبت ان سے بگڑی ہے پایانِ کار

(۳۲)

ہجو سگ پرست

اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہو گئی
تنگی کی جو حیلے نے تو رجعت سی ہو گئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
چیچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت وہ بر طرف
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

دتکارو کتے کو تو لہو اپنا وہ پیے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

یا جوتے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چپٹا یا ہے اب اپنے منہ کو بھی

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا
کتا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا

اک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اس کے منہ کو تئیں چومنے لگا

ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس
گردن میں اپنی ڈالے پھرے ہے ورد شب عرس

ٹکڑا ہو جس کے ہاتھ میں اس کا یار ہے
جیسے سگ سرائے سگ ہر سوار ہے

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے دوڑ اور دھاڑ
لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ

جو ہڈیوں پہ لڑتا رہا ہو بسان سگ
ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام لگ

انساں کو انس کتے سے اتنا ہوا ہے کب
ناپاک اس کو جانتے ہیں پاکیزہ لوگ سب

اصحاب کہف کا بھی جو سگ ہو تو ہے وہ سگ
نجم الدین کے بھی کتے کو کتا کہے ہے جگ

کر سگ تخلص اپنا جو آیا بروے کار
اکراہ سگ لوندے سے کرنے لگا دیار

رہتے نہیں نفور جو سگیانِ بے شعور
کھانے میں وہ بھی کہتے ہیں کتے کو دور دور

کیا جانیے کہ یہ کہ سگ کیا متاع ہے
بازار میں جو دیکھے ہے سگ کو سماع ہے

آدم گری اڑا رکھی حرف و سخن گیا
دیکھا جو خوب تو سگِ دیوانہ بن گیا

دم لابہ جو دیے تو لگے کرنے بدخصال
دوڑے سے دگر نہ کاٹنے کو کتے کی مثال

کم بخت یک غریب جیسے مردہ سا پایا ہے یہ
مرگھٹ کے کتے کی سی طرح پھاڑ کھائے یہ

ور مدعی ہو ٹک بھی قوی دل قوی نصیب
پھر آگے اس کے سوکھی ہی بلی ہے یہ غریب

رہتا ہے سخت شیفتہ کتوں کے بال کا
پلا ہے یہ کہے تو کسو کتے وال کا

کتوں کی لے کے زرد و سیاہ و سپید پشم
کس کس طرح سے دیکھتا ہے اب وہ بچشم

کتوں کے شوق میں جو یہ آتش ہے زیر پا
کہتا ہے اس کو اب سگِ پا سوختہ بجا

اس کی پلیدی شہرۂ ہر شہر ہی رہی
کتے کے کاٹے کی سی اسے لہر ہی رہی

دو ہیں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں
ہمسائیوں کی جھنجھو کے لیے کھائیں گالیاں

وہ مر گئیں تو دیر رہا روتا غم زدہ
پشتی کے پیچھے پھر نہ ہنسا ٹک ستم زدہ

لونگی کا گرم غم جو رہا سو کچھ نخ ہوا
برفی کی تعزیت میں سگ رویخ ہوا

بلی جو پالتا تھا بھلا ایک بات تھی
آئیں میں اس کی دوستی ایماں کے ساتھ تھی

نوراں کے لوگ ہو دیں کہ ہوں اہلِ اصفہاں
کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیوں کے ہاں

جس کو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکر زباں نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دیوے کتوں کو تو ٹرے ہے اپنی جاں
مر جائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے نداں

ہے بسکہ سگ پرست، مریگا جو یہ دنی — تو شے میں اس کے ہوگا نہ کچھ غیر سگ کنی

کتوں کے پیچھے پھرتا ہے گلیوں میں دور ہو — یہ سب ہے اس لیے کہ ہر اک جا پہ شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ — بہرہ ہے جن کو عقل سے وہ کیوں ہوں شیفتہ

ہے اس طرح کے معرکہ گیروں سے پُر جہاں
بہتیرے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

(۳۳)

در ہجو اکول

ایک ہے پرخور آشنا بے پیر — سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر

صد منی دیگ ہے شکم اس کا — نفسِ اژدہا ہے دم اس کا

آنت شیطان کی ہے اس کی آنت — دانت اس کا ہے ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آوے نہار — منھ ہے گویا کہ زخم دامن دار

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی — منھ ہے چھپٹوں سے جیسے وٹی جلی

گال کلچے سے پھر توے سے سیاہ — کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

توند کالی جو کھول جاوے لپیٹ — آہنی ہے تنور اس کا پیٹ

راہ مطبخ میں پاوے ہے جو کبھی — چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی

کھینچے باورچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اس کے چوتڑوں پہ پیاز

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے — چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ ہے اس کا — قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دو پیازہ کھا کے ہو تازہ — اک نوالا ہے قلیہ دوپیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہے خشک ہیں — ہڈیاں گویا تھیں اس کی خشتک میں

خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شب کو نان ہالۂ ماہ

نہ نکلے دیکھ کر وہ قاب پلاو — منھ ہی منھ بیٹھا گرچہ کھائے گھاو
کھانے پر جب وہ جی جلاتا ہے — لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے
نہیں پہنچے جو کھانا کھانے لگ — ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ
بھوک کا باولا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
دہیوں میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم — جائے گھل مل اگر سنے ہے حلیم
آتش بغرا یہ مار بھی کھاوے — اس میں گو بوغرا نکل جاوے
کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے — کچھ نہیں خفتیں ہی کھاتا ہے
بھوک سے جب کہ غصے میں آوے — بزکوہی کی طرح جھنجھلاوے
ٹھڈیوں کو نگہہ سے کھاجاوے — چنے لوہے کے بھی چبا جاوے
دھر کا جلنا آگ سے مانوں — بھوک اس کی جلے تو میں جانوں
نکلے بازار میں وہ جب چرپوز — سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز
گھاس پات اور کانس کھاتا ہے — نیشکر پر وہ بانس کھاتا ہے
اس کے آنے کی سن کے بازاری — کرتے ہیں سودوں کی خبرداری
کوئی تختہ کرے ہے دوکان کو — کوئی لاوے بلا گزر بال کو
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا — تکتے ہیں بنیے داو گھات اپنا
کہ مبادا ادھر کو آجاوے — سودے یک یک ہمیں کو کھاجاوے
اینٹ پتھر بھی کھا گزر جاوے — الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے
کیا کیا جینے کی کہیے چکھتا ہے — لیک پیٹ اس کو خوار رکھتا ہے
پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے — کوہ تک کا بھی حیف کھاتا ہے

وہ قضارا ہوا مرا مہماں — کھا گئی اس کی میزبانی جاں

گھر میں یا جو کچھ تھا بیچ منگوایا — کھانا اس کے لیے میں پکوایا

کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے — جس پہ سو مہماں کروں تجھ سے

مجھ سے ہے روزگار سے ان بن — خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن

چار من گاجروں کا قلیہ تھا — دہ منی دیگ بیچ دلیا تھا

روٹیاں کس قدر بتاؤں میں — جس کو دو چار سال کھاؤں میں

چاہ کر کے گرا جو وہ بلّاع — مددِ روح اشعب طمّاع

تھے ابھی روٹیوں کے جیٹ کے جیٹ — میں رہا کہتا کھا گیا وہ سمیٹ

کھانا کوئی اور کیا کہے اس کا — سارے منہ دیکھتے رہے اس کا

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روح توشے کی روٹی میں ہوگی

کھانے کی بو جو ناک میں بیٹھے — مر گیا ہووے تو بھی اٹھ بیٹھے

عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے

گور میں بھی کفن نگل جاوے